دار العلوم دیوبند

اور

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

تالیف

محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث و ادب دار العلوم وقف دیوبند

دارالعلوم دیوبند

اور

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ

تالیف

محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث و ادب دارالعلوم وقف دیوبند

ناشر

مکتبۃ النور دیوبند

نام کتاب : دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ

مصنّف : (مولانا) محمد اسلام قاسمی

استاذ حدیث وادب دارالعلوم وقف دیوبند

صفحات : ۱۷۶

تعداد : ۶۰۰

اشاعت : اکتوبر ۲۰۱۹ء

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

"**مکتبة النور**" دیوبند میں موجود بے شمار کتب خانوں میں محض ایک کتب خانے کا اضافہ نہیں ہے، بلکہ دینی کتب کی اشاعت کے ایک ایسے مرکز کا قیام ہے جس کے مقاصد میں مستند و معتبر علمائے کرام کی نایاب تصانیف کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنا،نسل نو کی دینی رہنمائی کرنا، اصلاحی کتابوں کو معاشرے کے افراد تک پہنچانا، مدارسِ اسلامیہ میں داخلِ نصاب کتب کی نسلِ نو کے اذہان کو سامنے رکھتے ہوئے جدید ترتیب و تحقیق اور حل لغات و اصطلاحاتِ فن کے اضافے کے ساتھ طلبۂ عزیز کی خدمت میں پیش کرنا، کسی بھی اہم اور تحقیقی کتاب کی اشاعت میں مصنّف کا بھرپور تعاون کرنا، مناسب قیمت پر طلبہ عزیز، مدارسِ اسلامیہ اور دینی اداروں و لائبریریوں کو کتابیں فراہم کرنا؛ داخل ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ مکتبہ کو معتبر علماء کی ایک جماعت کا تعاون حاصل ہے،جن کی نگرانی میں مکتبہ کے تمام امور انجام پاتے ہیں۔

مختصر سے عرصہ میں مکتبہ نے علمی حلقوں میں ایک منفرد شناخت قائم کی ہے،کئی ایک درسی کتابوں اوران کی شروحات کے علاوہ ''التوحید''، ''طلاق کا اختیار عورت کو کیوں نہیں''، ''الفاظِ طلاق کے اصول''، '' کامیاب طالب علم''، ''اصلاحی

گزارشات'' ، ''کتاب المعاملات''، ''اصلاحی باتیں''، ''تحفۂ مدرّسین''، ''نورالاصباح شرح اردو نورالایضاح''، ''اعمالِ قرآنی''، ''درخشاں ستارے''، ''داستاں کہتے کہتے'' وغیرہ جیسی علمی و معتبر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر والد محترم حضرت مولانا محمد اسلام قاسمی مدظلہٗ کی زیرِ نظر کتاب ''دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ'' پیش خدمت ہے۔ ''دارالعلوم دیوبند'' اور ''حکیم الاسلام'' ویسے تو یہ دو علیحدہ علیحدہ لفظ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دارالعلوم دیوبند اپنی شناخت و تعارف کے لیے حکیم الاسلام کا محتاج ہے، ویسے ہی حکیم الاسلام کا تذکرہ بغیر دارالعلوم دیوبند کے ادھورا اور نامکمل ہے۔ یہ بات دارالعلوم دیوبند کے وہ فیض یافتگان علیٰ وجہ البصیرت سمجھتے ہیں جنھوں نے اُن کے دورِ اہتمام میں دارالعلوم سے کسبِ فیض کیا، ادارے کے لیے اُن کی شبانہ روز جدوجہد کا مشاہدہ کیا، اس عظیم دانش گاہ کو عظیم تر بنانے اور اس کے تعارف کے لیے اُن کی مسافرانہ سرگرمیاں دیکھیں، مسلکی تصلّب کے ساتھ وسعتِ فکر و نظر کو سمجھا، ان کی ساحرانہ خطابت و گراں قدر علمی مقالات و تالیفات سے استفادہ کیا، ان کی ''نگاہِ انتخاب'' کے کرشموں کو قریب سے دیکھا جو ہر ''انتخابِ نگاہ'' کو کندن بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

اُن ہی سعادت مندوں اور حکیم الاسلام کے خوشہ چینوں میں والد محترم بھی ہیں، یہ کتاب دراصل اُن کے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو ''دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام'' دونوں کا جامع اور مختصر تعارف پیش کرتے ہیں، دو ابواب پر مشتمل یہ کتاب قارئین کو بابِ اوّل میں قیامِ دارالعلوم کے مختصر تاریخی پس منظر سے روشناس کراتی ہے، جب کہ بابِ دوم میں حکیم الاسلام کی زندگی کے مختلف گوشوں اور ان کی خدمات کے متعدد زاویوں سے آگاہ کرتی ہے۔ چوں کہ یہ

مقالات مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے کہیں کہیں پر کچھ تکرار بھی محسوس ہوتا ہے، تاہم سیاق وسباق سے اُس کا مضبوط ربط آپ کو تاریخی معلومات کے ساتھ ادبی چاشنی بھی فراہم کرے گا۔ انشاء اللہ

کتاب کے شروع میں حکیم الاسلام کے علمی و عملی جانشین، خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نوراللہ مرقدہٗ کی تقریظ بھی کتاب کی معتبریت میں اضافہ کرتی ہے جو حضرت نے تقریباً پانچ سال قبل تحریر فرمائی تھی، گوناگوں وجوہات کی بنا پر کتاب کی طباعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی، تاہم اللہ کے فضل وکرم سے اب یہ مجموعہ مقالات ومضامین آپ کے حوالے ہے۔

بدرالاسلام قاسمی

استاذ جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

یکم صفرالمظفر ۱۴۴۱ھ

۱۳ر ستمبر ۲۰۱۹ء

کلماتِ تقریظ

خطیب الاسلام حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ

صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند و نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

محترم ومکرم مولانا محمد اسلام صاحب (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وقف) کی

بیش قیمت کتاب!

دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ

''دارالعلوم دیوبند'' کے منصب اہتمام پر فائز حضرت حکیم الاسلام کی ساٹھ سالہ بیش قرار تاریخ ساز عالم گیر خدمات عظیمہ نے ہی حسب ارشاد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ بلاشرکت غیرے دارالعلوم دیوبند کو عالمی دینی مرکز کے مرتبہ عظمیٰ تک پہنچایا۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زبردست تاریخی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے مسلک حق کی ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے چالیس سے زائد ممالک میں ایسے مدلل و دلنشیں طریق پر ترجمانی فرمائی ہے کہ جس کے ذریعہ لاکھوں لاکھ قائلین لا الٰہ الا اللہ نے روح اور اصل حقیقت اسلام کو دل لگتے انداز پر سمجھا اور وہ اپنی طاعات، عبادات، معاملات، معاشرت اور تجارت وغیرہ میں بدعات وشبہات کے دلدل سے نکل کر صحیح صراط مستقیم پر گامزن بھی ہو گئے اور اتباعِ سنت وشریعت کی رہنمائی کی دولت سے مالا مال بھی۔

''دارالعلوم دیوبند'' کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے دلائل منقولہ اور معقولہ

سے مدلّل و مبرھن طریقہ پر ماخوذ، اور امت کے مستند مفسرین کرام، محدثین عظام، مجتہدین باحترام، اور ائمہ علم کلام کی متفق علیہ تفاصیل شرعیہ پر مبنی اس مذہب اہل سنت والجماعت کا ترجمان ہے، کہ جس پر امت مسلمہ کی اکثریت قائم و عامل ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے عالمگیر پیمانے پر انتہائی پُر تاثیر و مدلل اور دلنشیں پیرایۂ خطابات میں ترجمانیٔ مسلکِ حق ہی ''دارالعلوم دیوبند'' کی عالمی پیمانے پر علمی اور دینی مرکزیت کا واحد سبب بنی۔ **ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء**

اس لیے حضرت مہتمم صاحب کی عظیم علمی افادیت کو اور دارالعلوم کی عظمت کو دارالعلوم سے عقیدت و محبت رکھنے والے قائلین نے کبھی دو خانوں میں تقسیم نہیں کیا، حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذاتِ گرامی اور دارالعلوم کی وحدت پر دو درج ذیل واقعاتی شہادتیں ہیں کہ جن کے بعد یہ وحدت علمی کسی دلیل مزید کی ضرورت مند نہیں رہتی۔

پہلا واقعہ حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ دریا بکوزہ کا مصداق ہے کہ عزیز مکرم مولانا محمد طیب صاحب کی ذات خاص میں حق تعالیٰ نے بلا استثناء تمام اکابر رحمۃ اللہ علیہ کی علمی استنادات اور معنوی انتسابات کو یکجا فرما دیا ہے گویا جس نے حضرت حکیم الاسلام کی زیارت کر لی اس نے بالفاظ دیگر تمام اکابر کی زیارت کر لی۔

پھر اس حقیقت کی تائید قوی و مزید حضرت حکیم الاسلام کے شیخ مجدد وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا مرض الوفات میں یہ عارفانہ عمل ہے کہ حضرت حکیم الاسلامؒ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں ہفتہ عشرہ میں حاضری کے معمول کے مطابق تھانہ بھون تشریف لے گئے، حضرت شیخ غیر معمولی کمزوری و شدید نقاہت کی حالت میں تھے، اور دو روز بعد ہی دارالعلوم

میں مجلس شوریٰ کی نشست ہونے والی تھی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے حضرت شیخ کی یہ حالت دیکھ کر مزید قیام کا ارادہ ظاہر کیا، تو حضرت شیخ نے اصرار سے فرمایا کہ شوریٰ میں آپ کی شرکت ضروری ہے، اس ہدایت پر حضرت حکیم الاسلام نے دوسرے روز واپسی کا ارادہ فرمایا اور روانگی سے قبل حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں حضرت والا کے حسب الحکم واپس جارہا ہوں، یہ سن کر حضرت نے غیر معمولی نقاہت کے باوجود حضرت حکیم الاسلامؒ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اسے چوما اور سر پر رکھا اور قلب سے لگایا، حضرت حکیم الاسلام پر بحیثیت مرید و مسترشد حضرت کے اس غیر متوقع عمل سے شرم و ندامت سے اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ڈاڑھی تر ہوگئی، پھر باادب عرض کیا کہ حضرت والا کے دست باکرامت کے ساتھ اس عمل کی تو مجھ ناچیز کو اجازت ملنی چاہیے تھی جس کی خواہش کے باوجود میں نے حضرت کے اصول کی وجہ سے کبھی جرأت نہ کی اور حضرت کے اس خوردنواز عمل نے مجھے تو سراپا ندامت بنادیا، حضرت شیخ نے عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی، فرمایا: ''میں نے ظاہری طور پر تو اپنے عزیز مکرم محمد طیب کے ہاتھوں کو چوما لیکن حقیقتاً میں نے اپنے تمام اکابر سے استفادۃً اپنے اس آخری وقت اس دست بوسی کے ذریعہ معنوی قوت کو حاصل کرنے کا شرف حاصل کرلیا، جو میرے لیے ان شاء اللہ ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگا۔'' اس ارشاد مرشد کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ گریۂ بیکراں کے ساتھ حضرت شیخ کی دست بوسی کر کے دیوبند عازمِ سفر ہوگئے، واپسی کے بعد اگلے روز شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، آغازِ جلسہ پر ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ کی وفات حسرت آیات کی المناک اطلاع آگئی، اس کے فوراً بعد تمام ارکانِ شوریٰ اور متعدد مدرّسین وغیرہ نماز جنازہ میں شرکت کے لیے تھانہ بھون روانہ ہوگئے۔

حکیم الاسلامؒ کے ساتھ ان کے اکابر رحمہم اللہ کا اس قسم کا محبّانہ ومخلصانہ تعامل حضرت حکیم الاسلامؒ کی علماً اور عرفاناً جس عظمت و برتری پر شاہد بنتے ہیں ان کے بعد مزید اشتہادات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس لیے اسی پر اکتفا کرتے ہوئے عرض ہے کہ مصنفِ کتاب محترم مولانا محمد اسلام صاحب زیدت عنایتہٗ کی تقریظ کی فرمائش کی تکمیل اس اعتراف کے ساتھ کر رہا ہوں کہ اگرچہ مصنف محترم نے حق موضوع بڑی جامعیت کے ساتھ ادا کر دیا ہے لیکن شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے جو فرمایا اس کو بھی ایک امر واقعہ کے طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے۔

نہ حسنش غایتے دارنہ سعدی راسخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند
۱۴۳۷ھ

مشمولات:

بلادِ ہند میں مسلمانوں کی آمد، مسلم حکومتوں کا قیام، اسلامی علوم وفنون کی تعلیم و اشاعت، مغلیہ عہد حکومت کا عروج و زوال، امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فیض یافتہ افراد کی خدمات، برطانوی حکومت کا تسلط اور ۱۸۵۷ء کے حالات۔ایک اجمالی نظر

پھر علمائے دین کی توجہ، دینی تعلیم کی اشاعت، اور مسلمانوں کے عقائداوران کی تہذیب وشناخت کی بقاپر،

اوراس کے لئے دیوبند میں دینی عربی مدرسہ کی بنیاد، جو دارالعلوم دیوبند کے نام سے ایک علمی تحریک کے بطور تاریخِ اسلامیانِ ہند کا ایک زرّیں باب ہے۔

بلاد ھند میں

اوّلین نقوشِ اسلام

بلاد ہند و سندھ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ عہد خلفائے راشدین ہی میں شروع ہو چکا تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مدت خلافت بہت مختصر تھی، جو بلاد عرب ہی میں پیش آمدہ بغاوتوں و ارتداد کی سرکوبی میں صرف ہوئی اور اس میں مختصر فتوحات بھی تھیں مگر عہد عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں اسلام کا دائرہ بھی وسیع ہوا، اسلامی سلطنت کی وسعت ہوئی اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے بابرکت قدم بلاد عجم میں بھی داخل ہوئے، اسی دور میں امیر المؤمنین کے حکم پر بلاد ہند و سندھ کے تین اہم مقامات تھانہ، بھڑوچ اور دیبل میں صحابۂ کرام نے پرچم اسلام لہرایا، تاریخ وسیرت کی کتابوں میں ہمیں بارہ صحابہؓ کے نام ملتے ہیں جو عہد فاروقی میں بسلسلۂ جنگ و جہاد برصغیر میں وارد ہوئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین منتخب ہوئے، ان کا عہد خلافت بھی طویل عرصے تک رہا جس میں فتوحات اسلامی کا دائرہ دور دراز علاقوں تک پھیلا، اِن کے ہی زمانے میں بلاد ہند میں مکران، سندھ اور بلوچستان کے متعدد علاقوں پر علَمِ فتح لہرائے، ان مجاہدین میں پانچ صحابۂ کرام کے نقوش بھی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسند خلافت کو زینت بخشی مگر

جزیرۃ العرب میں مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا اور ایک حد تک خانہ جنگی کی صورت بھی پیدا ہوئی، فطری طور پر فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہوسکا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ فتوحات کا سلسلہ بالکل موقوف ہوگیا ہو، صحابہؓ اور تابعین کی بڑی تعداد مفتوحہ علاقوں سے آگے بڑھنے میں مشغول رہی، برصغیر میں جیوشِ اسلامی بالائے مکران سے ہوتے ہوئے سندھ اور پھر قیقان پہونچے، اس مقام کو اب قلات کہا جاتا ہے، ان مجاہدین میں تین صحابی بھی برصغیر میں داخل ہوئے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں آنے والے صحابۂ کرام اور تابعین کی جماعت نے برصغیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی، پھر اموی خلافت کا دور شروع ہوا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی بلادِ ہند میں بعض صحابہ اور بیشتر تابعین سرگرمِ جہاد رہے اور بہت سے مفتوحہ علاقے ان بابرکت ہستیوں کی امارت میں رہے۔ چنانچہ یہ خطۂ ارض مرکز اسلام سے بہت دور ہونے کے باوجود آغاز اسلام ہی سے اس سے آشنا ہوچکا تھا اور اسلام کی صدائے بابرکت اس وسیع ملک کی فضاؤں میں گونجنے لگی تھی۔ یہ خطہ بہت سے تابعین کرامؒ کا مسکن رہا ہے، ان میں وہ حضرات بھی تھے جو مختلف اوقات میں جہاد کے لیے یہاں آئے اور وہ بھی جو تبلیغ واشاعتِ دین کی غرض سے وارد ہوئے، ان حضرات نے قرآن وسنت کی نشر وترویج کو اپنا مطمحِ نظر بنایا، ان تابعین کرامؒ کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے، ان ہی جلیل القدر شخصیات میں ایک نمایاں نام محمد بن قاسم ثقفی کا ہے۔ جن کو باضابطہ طور پر فاتح ہند وسندھ کہا جاتا ہے۔

اس طرح پہلی صدی ہجری کے نصف اول ہی میں بلادِ ہند کے بہت سے لوگ اسلام سے آشنا ہوچکے تھے اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت نے ان کو اپنے دائرۂ اثر میں لینا شروع کر دیا تھا۔ جو علاقے فتح کئے جاچکے تھے ان میں حسب حال امارتیں

بھی قائم ہو گئیں تھیں اور اسلامی اصول وآداب کے مطابق نظم ونسق قائم ہو چکا تھا، اور امن وامان بھی تھا مگر پہلی صدی کے نصف آخر میں ان امارتوں سے انکار اور بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، مفتوحہ علاقوں پر متعین حکمرانوں نے مرکزی خلافت سے بغاوت کی راہ اختیار کر لی تھی اور کافی عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ جب اموی عہدِ حکومت میں عبدالملک بن مروان اسلامی مرکزی حکومت پر تخت نشین ہوئے تو ان کے مقرر کردہ گورنر حجاج بن یوسف ثقفی نے مشرقی ممالک کی بغاوتوں کو کچلنے کی ٹھانی، وہ عراق کا والی تھا مگر مشرقی ممالک خاص طور پر بلادہند کے معاملات کی اضافی ذمے داری بھی اسی پر تھی، چنانچہ باغیوں کو شکست دینے اور مفتوحہ علاقوں کو دوبارہ اپنے کنٹرول میں کرنے کیلئے مختلف فوجی جماعتیں بھیجیں، اُدھر کئی سالوں سے عربوں میں بھی اندرونی اختلافات جاری تھے اور اِدھر مسلم حکمرانوں نے اموی حکومت کے خلاف بغاوتیں بھی کر دیں، اورآس پاس کے غیر مسلم حکمرانوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں، خاص طور پر سندھ میں راجہ داہر نے آنکھیں دکھائیں، جب ولید بن عبدالملک ۸۶ھ میں متمکن خلافت ہوا تو حجاج بن یوسف نے باضابطہ طور پر ان باغیوں کی سرکوبی کیلئے بلادہند میں اپنے ایک عزیز رشتے دار محمد بن قاسم کی سرکردگی میں کئی ہزار افراد پر مشتمل فوج کو روانہ کر دیا، اور جب محمد بن قاسم نے فارس (شیراز) کی طرف سے سندھ کی طرف یلغار کی، تو چھ ہزار شامی فوج ان کے ہم رکاب تھی۔

اب یہ اسلامی فوج سندھ کے مختلف شہروں اور ریاستوں کو فتح کرتی گئی اور وہاں اپنے گورنر متعین کرتی گئی، جہاں کے باشندوں یا حکمرانوں نے صلح کی ان سے مصالحت ہوئی۔ راجہ داہر کا مرکزی مقام شہر دیبل تھا جس کو فتح کرنا آسان نہیں تھا مگر جب یہاں خوں ریز جنگ ہوئی اور راجہ داہر خود ہاتھی پر سوار اپنی فوج

کی کمان سنبھالے ہوئے تھا، اللہ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی، راجہ داہر مارا گیا، اس سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوئے، مخالفین کے حوصلے پست، نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں جہاں محمد بن قاسم کی فوج گئی وہاں ان کو فتوحات حاصل ہوئیں یا پھر لوگوں نے خود صلح کر لی۔ اس طرح اسلامی فوج کی پیش قدمی جاری رہی اور بڑے بڑے شہر سرنگوں ہوتے گئے، دو سال سے کچھ زائد عرصے میں سندھ کا سارا علاقہ فتح کرلیا گیا۔

۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے انتقال کے بعد محمد بن قاسم نے مفتوحہ علاقوں کے نظم ونسق پر خصوصی توجہ دی، امن وامان قائم کئے، ضرورتمندوں کی حاجت روائی کی، اور پھر وہ وقت آیا جب ولید بن عبدالملک کا انتقال (۹۶ھ) ہوا اور اسکا بھائی سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے دمشق بلوالیا۔

مگر سندھ پر جو بھی والی محمد بن قاسم کے بعد آئے وہ نظم ونسق اور امن وامان برقرار نہ رکھ سکے، اتنا ضرور ہوا کہ اب یہاں کے ارباب اقتدار غیر مسلموں نے مسلمانوں کی رواداری اور دین اسلام کی خوبیاں دیکھ کر، اسکی تعلیمات ودعوت سے متأثر ہوکر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

اس طرح بلاد ہند میں اسلام کی آمد، اشاعت وترویج اور اسکی قبولیت کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔

(فتوح البلدان للبلاذری، تاریخ ملت جلد سوم، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش)

ہندوستان میں

مسلم حکومتوں کا آغاز

بنو امیّہ کے دور خلافت میں اسلامی سلطنت کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں، بلادِ شرق وغرب میں اسلامی پرچم لہرا رہا تھا مگر ابھی اس دور کے سو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ بلاد عرب میں بھی اور بلاد خراسان میں اندرونی طور پر اہل بیت کی خلافت کے عنوان سے تبلیغ کا عمل شروع ہو چکا تھا جو ۱۳۲ھ میں بنوعباسیہ کے دور خلافت کے آغاز کی صورت میں ظاہر ہوا، اب دارالخلافہ دمشق سے عراق منتقل ہو چکا تھا، اور اس حکومت کا قیام ابومسلم خراسانی اور بلاد خراسان ومشرقی ریاست کی ہمنوائی کی بدولت ہوسکا تھا، پھر بنوعباسیہ کی خلافت کئی سو سال تک باقی رہی مگر ان کے دست و بازو بلاد عجم کے افراد تھے جن میں مختلف ممالک، ریاستوں اور قوموں کے افراد تھے، جو رفتہ رفتہ یا تو ریاستوں کے خودمختار حکمراں بن گئے یا ایک طرح سے بغداد سے بغاوتیں کر دیں، اب صرف بنوعباسیہ کے عرب افراد ہی تمام اسلامی ریاستوں کے واحد حکمراں نہیں رہے، البتہ بہت سے امراءِ عجم نے بغداد سے اپنا رشتہ برقرار رکھا، اور اپنی خودمختاری کے باوجود وہ عراق کی حکومت کو مرکزی حکومت یا سرپرست تسلیم کئے رکھا۔ اور خطبوں میں مرکزی حکومت کے حکمرانوں کو امیر المؤمنین ہی کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

بنوامیّہ کے دور میں سلطنت کی سرحدیں جتنی پھیل چکی تھیں بنوعباسیہ کی طویل اور مضبوط حکومت کے باوجود ان میں کمی آنے لگی تھی، چوتھی صدی ہجری میں بلاد شرق میں افغانستان میں غزنوی حکومت قائم ہو چکی تھی، یہ حکومت ماوراء النہر کی سامانی حکومت سے پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ ایشیا سے لیکر ہندوستان تک پھیل گئی۔ اس حکومت کا بانی سامانی حکومت کے خراسانی امیر کا غلام سبکتگین تھا جو ۳۶۶ھ میں غزنیں کے تخت پر فروکش ہوا، محمود غزنوی اسی کا نامور فرزند تھا۔

اور گو کہ محمود غزنوی نے خراسان اور اس سے ملحق بہت سے علاقوں کو فتح کرلیا تھا مگر اسکی شہرت ہندوستان کی فتوحات کے سبب زیادہ ہے۔ اس نے اس ملک پر سولہ یا سترہ حملے کئے اور پنجاب، قنوج، میرٹھ، متھرا، مالدہ، گوالیار اور گجرات کی متحدہ فوجوں کو شکست دیکر پنجاب پر مکمل قبضہ کرلیا، ساتھ ہی ملتان اور سندھ پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

محمود غزنوی ۳۸۹ھ سے فاتح اعظم کی حیثیت سے سامنے آیا اور غزنوی خاندان کی حکومت جاری کی، ہندوستان میں غزنوی حکومت کا خاتمہ ۵۸۲ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے کیا، اب ان علاقوں پر غوری خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔

عام طور پر ہندوستانی مؤرخین محمود کی حکومت کو کشت وخون، فتوحات اور حرص ودولت کے کارناموں سے تعبیر کرتے ہیں مگر معروف مؤرخ ابن اثیر نے محمود غزنوی کو عاقل، دیندار، نیک سیرت اور صاحب علم فرمانروا قرار دیا ہے۔ صاحبِ جواہر المضیہ نے اسکو حنفی فقہاء میں شمار کیا ہے، لکھتے ہیں کہ محمود ممتاز فقہاء میں تھا، فصاحت و بلاغت میں یگانہ تھا، حدیث، خطبات ورسائل میں اسکی تصانیف ہیں۔

غزنوی حکومت کا ستارہ طویل عرصے تک عروج پر رہا، مگر اخیر میں ان کے آپسی اختلافات اور غوری خاندان کے امراء کی قوت کی وجہ سے ۵۸۲ھ (۱۱۷۴ء)

میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے غزنوی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔ شہاب الدین محمد غوری نے ان کی جگہ ہندوستان کی باگ ڈور سنبھالی اور ۵۹۸ھ تک تمام غزنوی امراء کو ختم کر دیا، پھر اسکی وفات ۶۰۲ھ (۱۲۰۶ء) کے بعد ہندوستان کی حکومت قطب الدین کے ہاتھ میں آئی جو غوری کا مملوک تھا اور اس نے پایۂ سلطنت دہلی ہی کو اپنایا، قطب الدین ترکی الاصل تھا، اس نے شجاعت اور جوانمردی کے ساتھ ہندوستان میں حکومت کی پھر یکے بعد دیگرے مختلف خاندان ہندوستان کے مختلف علاقوں پر حکومت کرتے رہے، التمش اور اسکے خاندان کے افراد، پھر فیروز شاہی حکومت، خلجی حکمرانی، تغلق شاہی دور حکومت کے علاوہ مختلف سلاطین، بہمنی، عماد شاہی، بریدشاہی، قطب شاہی، عادل شاہی دور حکمت شامل ہیں۔

(تاریخ اطلس العالم الاسلامی، تاریخ ملت، معجم البلدان، تاریخ اسلام شاہ معین الدین ندوی)

مغلیہ دورِحکومت

علماء ومشائخ

مغلیہ دورحکومت کا آغاز ظہیرالدین محمد بابر (۹۳۲ھ) سے ہوتا ہے، برصغیر پر مغلوں کی حکومت ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط ۱۸۵۷ھ تک جاری رہتی ہے۔

مغل فرمانرواؤں میں جنکی حکومت مستحکم، طویل اور دور دراز علاقوں تک رہی ہے، ان میں نمایاں نام ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر ہیں، ہم یہاں مختصر طور پر ان حضرات کے دورحکومت میں ہندوستان کی حالت، مذہبی امور، دینی علوم وشعائر کی اشاعت اور معروف مسلم علماء ومشائخ کے کارناموں کو ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ظہیرالدین بابر نے ڈالی جو تیمور کی نسل کا تھا، اور یہ اصلاً ترک تھے جن کے آبا واجداد ماوراء النہر سمرقند و بخارا میں رہے، چنانچہ سب سے پہلے بابر گیارہ برس کی عمر میں ترکستان کے شہر فرغانہ (موجودہ زمانے میں تاجکستان کا ایک صوبہ) میں تخت نشین ہوا۔ طویل کشمکش کے بعد اسے موروثی وطن چھوڑنا پڑا، پھر کابل میں حکومت قائم کی، اسکے بعد ہندوستان آیا جب اس نے پانی پت کے میدان میں ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کوشکست دی اور دہلی پر قابض ہوا اور مختلف فتوحات کے بعد آگرہ میں قیام پذیر ہوا، تب گویا اسے

ہندوستان کی حکومت ملی۔ ۱۵۳۰ھ میں اسکی وفات ہوئی اور اسکے بیٹے ہمایوں کو تخت وتاج ملا، مگر دس سال کے عرصے ہی میں اسکو شیر شاہ سوری نے شکست دیدی اور اس خاندان کی حکومت پندرہ سال تک رہی۔ ہمایوں ان پندرہ سالوں میں کابل اور ایران کے علاقوں میں رہا اور ایرانی بادشاہ کی مدد سے قندھار اور کابل کے بعد ۱۵۵۵ء میں دوبارہ ہندوستان آیا اور دہلی وآگرے پر قابض ہوا مگر ابھی حکومت میں استحکام نہیں آیا تھا، باضابطہ مستحکم حکومت اکبر کے دور میں قائم ہوئی ہے۔

اور گوکہ بابر اور ہمایوں امیر تیمور کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر اپنی تہذیبی وعلمی روایات کے ساتھ ایرانی تہذیبی اثرات کے حامل بھی ہیں، ہمایوں کے دور میں تو چونکہ ایران کی مدد سے ہی دوبارہ حکومت حاصل ہوئی تھی اسلئے دربار میں ایرانی امراء، شعراء، مصور، اہل قلم اور دوسرے افراد ایران سے آئے اور اسی وقت سے ایران اور ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی اثرات زیادہ نمایاں ہوگئے اور ملک پر شیعہ عمال کا زیادہ عمل دخل ہوگیا۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی علوم کا فروغ بھی برصغیر میں عہد مغلیہ ہی میں ہوا، کیونکہ اب حکومت بھی مستحکم تھی اور اہل علم اور مراکز علوم کو حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ سلاطین کے دربار میں بھی اصحاب علم وفضل تھے اور مختلف شہروں میں مدرسے بھی قائم تھے، علماء کے مصارف بھی شاہی خزانے سے ادا ہوتے تھے۔ اسی طرح اس دور میں ہندوستان کے تعلقات عرب اور حجاز سے بھی بہتر ہوگئے تھے، اسلئے علوم اسلامی کے طالبین کیلئے گجرات کی بندرگاہوں سے جہاز کے ذریعے حجاز پہونچنے میں آسانی ہوگئی۔ جہاں وہ اسلامی علوم خاص طور پر علم حدیث حاصل کرکے اپنے علاقوں میں درس وتدریس کے مرکز بن گئے۔

ہمایوں کے بعد اکبر تخت نشین ہوا، تو اب مغلیہ حکومت کی سلطنت میں مکمل استحکام آیا۔ مگر بدقسمتی سے اسی دور میں دین اسلام، عقائد وشعائر اور اسلامی

شناخت کو سب سے زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ تقریباً پچاس سال کے اکبری دورِحکومت کو عظیم ترین مسلم حکومت کا نام دیا جاتا ہے اور خود اکبر کو ''مغل اعظم'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے جسکی سلطنت کی سرحدیں کابل، قندھار، کشمیر سے لیکر جنوب میں احمد نگر اور مشرق میں اڑیسہ تک ممتد تھیں مگر اس دور میں خود اکبر نے دین اسلام کو ''دین الٰہی'' کے خود ساختہ مرکّب میں بدل کر جو نقصان اسلام، علماء دین، شعائر وتعلیماتِ اسلامی اور مکمل اسلامی تہذیب کو پہونچایا تھا وہ بھی ''عظیم تر'' ہے اور درباری علماءِ دین نے جس طرح اکبر کو گمراہ اور دین بیزار کیا تھا اگر طبعی طور پر وہی سلسلہ جاری رہتا تو نہ جانے تمام ادیان کا مرکب اور حلال وحرام سے بے نیاز اور خدا اور اسکی مخلوق سے بے زار کونسی امت اس برصغیر میں رہتی؟

مگر اللہ کی قدرت بہرحال ہر تدبیر وسیاست اور ہر شوکت وسلطنت پر غالب ہے، اپنی قدرتِ غیب سے اللہ نے برصغیر کے مسلمانوں کی شناخت اور دین کی حفاظت کیلئے ایک مردِ مجاہد، ولیٔ کامل، ظاہری و باطنی کمالات سے مزیّن شیخ احمد فاروقی سرہندی مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو سرزمین پنجاب میں ظاہر کیا جنھوں نے صحیح اسلام اور شریعت محمدی کی اشاعت وحفاظت اور اربابِ حکومت کی اصلاح کیلئے واقعۃً مجددانہ کارنامے انجام دیئے اور تمام باطل قوتوں سے مقابلہ کیا۔ درحقیقت اسلامی ہجری کے دوسرے ہزارے میں برصغیر کی سرزمین میں اسلام کی بقا کو اللہ نے ان کی ذات سے ہی منسوب کرایا۔ اسلئے انکا لقب بھی مجدد الف ثانیؒ قرار پایا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ بمقام سرہند ۹۷۱ھ (۱۵۶۴ء) پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر اس وقت کے باکمال مشائخ سے دیگر علوم حاصل کئے، قاضی بہلول بدخشانی سے علومِ تفسیر وحدیث کی معتد بہ کتابیں بشمول جامع البخاری کی تکمیل کی، شیخ یعقوب صرفی کشمیری بھی آپ کے بااثر استاذ رہے جن سے حدیث کی بھی کتابیں پڑھیں۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سرہند میں ہی درس علوم کا

سلسلہ شروع کیا اور مدت تک طالبانِ علوم کو فیوض و برکات سے بہرہ ور فرماتے رہے، پھر غالباً بیس سال کی عمر میں آپ اکبرآباد (آگرہ) تشریف لے گئے جو مغل حکمراں اکبر کا پایۂ تخت تھا اور جہاں لادینیت اور الحاد کا دور شروع ہو چکا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اب اصلاحِ حکمراں وامراء کے ساتھ دعوت وتبلیغ اور سلوک وطریقت کے باب میں اپنے آپ کو وقف کر دیا، اور گو کہ طاعون کے ایک مرض میں شدید مصائب سے بھی ٹکرائے اور افراد خانہ کی موت کے صدمات سے دو چار ہوئے، ان ہمت شکن حالات میں بھی آپ نے جو صبر وسکون اپنایا، جس عالی حوصلگی اور تسلیم ورضا کا ثبوت دیا وہ بذات خود آپ کی بزرگی اور خدارسیدگی کی بیّن دلیل ہے۔

قیام آگرہ کے دوران اکبر کے دو درباری علماء ابوالفضل اور فیضی سے تعلقات رہے، ان دونوں نے آپ سے استفادہ بھی کیا، مگر اکبر کی بے دینی یا گمراہی میں وہ دونوں شریکِ مجلس رہے، ان کے علاوہ درباری خوشامدیوں اور علماء سوء کی جدّت طرازیوں نے جو انتشار پیدا کیا تھا اسے روکنے کیلئے متعدد علماء نے حصہ لیا، اور اواخر عہد اکبری میں مرکزی حیثیت سے خواجہ باقی باللہ اور ان کے دست راست حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے نمایاں کردار رہا۔ دربار شاہی کے مباحثوں سے پیدا شدہ خرابیوں کے علاوہ بھی اطرافِ ملک میں مسلمان دوسری مشکلات سے دو چار تھے جن کی طرف حضرت مجدد الف ثانیؒ نے توجہ دلائی، امراء وارا کینِ سلطنت کو ان کے فرائض یاد دلائے اور شعائر اسلام کی بجا آوری واسلام کی سر بلندی پر زور دیا۔ مسلمانوں کے اس با اثر طبقے کی اصلاح اور ان کو انکے فرائض کی جانب متوجہ کرنے کے علاوہ انھوں نے عامۃ المسلمین، جمہور علماء اور صوفیاء کے خیالات کی بھی اصلاح کی۔

یہ واضح رہے کہ برصغیر میں اسلام پر تصوف کا رنگ چڑھا ہوا رہا اور صوفیاء میں بھی ایسے سلسلے ہوئے جو شریعت سے آزاد ہوکر طریقت کا عنوان لیے ہوئے تھے، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایسے طریق کی اشاعت فرمائی جس میں اسلامی شریعت کی پیروی پر بڑا زور رہے، بالفاظ دیگر حضرت نے مروّجہ طریقوں کے برخلاف شریعت کی پابندی ہی کو اصل دین قرار دیا اور یہ خدمت بھی حضرت کا عظیم تر تجدیدی کارنامہ ہے۔

اکبر کے بعد سلطنت کی ذمے داری جہانگیر نے سنبھالی، اور اس نے شریعت کا احترام بھی ملحوظ رکھا مگر بوجوہ جہانگیر نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں جو نامور عالم اور محدث ہوئے ان میں نمایاں طور پر شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کا نام آتا ہے، جو حضرت مجدد کے عقیدت واحترام کے باوجود ان سے کچھ اختلافات بھی رکھتے تھے مگر حقیقت میں ان کا مشن بھی شریعت پر عمل آوری اور علوم اسلام کی ترویج رہا، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے حجاز سے علم حدیث کی تکمیل کی، شیخ عبدالوہاب متقی سے استفادہ کیا جو شیخ علی متقی کے شاگرد ہیں اور ان کی طرح شیخ محمد طاہر پٹنی محدّث نے بھی علم حدیث حاصل کیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے سلسلے میں مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ہندوستان میں علم حدیث کو پہلی دفعہ انھوں نے ہی عام کیا ہے، نہ صرف درس وتدریس کے ذریعہ بلکہ اپنی گرانقدر تصنیفات کے ذریعہ بھی۔ اور یہ سلسلہ ان کے جانشین صاحبزادے شیخ نورالحق محدث نے جاری رکھا۔ اگرچہ ابھی علم حدیث کی تدریس میں بنیادی طور پر ''مشکوٰۃ المصابیح'' کو ہی اہمیت ملی یا صحیح بخاری کو۔

☆

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کو قطعی استحکام حاصل ہو چکا تھا، اکبر کی فتوحات کو مغل حکمرانوں نے ضائع نہیں ہونے دیا، اکبر کے بعد جہانگیر اور اس کے بعد شاہجہاں کا دور آیا، اس نے خود دربار میں اور عامۃ المسلمین میں کچھ اصلاحات کئے، اور اکبر یا جہانگیر کے دور میں جو طریق کار خلاف شرع تھے اسکو ختم کرنے کی کوشش کی، خاص طور پر درباری سجدے کو موقوف کیا اور اسلام اور شعائر اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا، مگر حکومت مغلیہ کی اپنی مجبوریاں بھی تھیں، سلطنت وسیع تھی، رعایا میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ، اور مسلمانوں میں بھی اسلامی تعلیمات اور ارکان کے تئیں وفاداری اور عمل بجا آوری کم تھی، اسلئے مغل حکمرانوں نے اپنی حکومت کو اسلامی شریعت کے مطابق بنانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی، بلکہ استحکام حکومت کی خاطر ''صلح کل'' کی پالیسی ہی اپنائی، فقہ وشریعت کو اساسِ مملکت نہیں بنایا، حکمرانوں کے علاوہ امراء، درباری افراد اور عمائدین میں جو برائیاں اور خرابیاں تھیں وہ بھی نظر انداز کی جاتی رہیں، مگر جب شاہ جہاں کے بعد محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ نے حکومت سنبھالی تب سابقہ حکومتوں کے برخلاف حکومت میں اصلاح کا عمل شروع ہو گیا۔ اورنگزیب نے اپنی ساری کوششیں ان خرابیوں کا قلع قمع کرنے میں صرف کر دیں جو اس زمانے میں رائج تھیں اور خود دربار سے برائیوں کو مٹایا، اور اپنی پرہیز گاری، تقویٰ اور سادگی سے اپنی رعایا کیلئے نیک مثال قائم کی۔ اور حکومت میں فقہ وشریعت کو عروج دیا، ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا، عدل وانصاف کا محکمہ قائم ہوا اور علماء کے سپرد ہوا، علماء و مشائخ کی عزت افزائی کی۔ علوم اسلامی کی اشاعت پر زور دیا، مراکز قائم کئے۔ اور اسلامی قوانین سے متعلق علماء کی ایک جماعت سے فقہ حنفی کی بنیادوں پر ایک عظیم ترین کتاب مرتب کرائی جو ''فتاویٰ عالمگیری'' کے نام سے موسوم ہے اور آج تک اسے استناد کا

درجہ حاصل ہے۔

اورنگزیب عالمگیرؒ کا عہدِ حکومت ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء حکومت مغلیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، جب غزنی سے لیکر چاٹگام تک اور کشمیر سے کرناٹک تک تمام ملک ایک ہی باشاہ کے زیرنگیں تھا، اس حکمراں کومختلف قوموں سے جنگ بھی کرنی پڑی اور سب سے زیادہ شورش مرہٹوں کی جانب سے ہوئی مگر بالآخر اسلامی ہندوستان کے آخری جلیل القدر بادشاہ نے ان تمام قوتوں کومغلوب کردیا۔ بادشاہ کی بیدار مغزی ، ہمت و استقلال اور رعایا پروری نے حکومت کوعروج تک پہونچادیا۔ مگر یہیں سے تاریخ نے کروٹ لی ہے، اس عظیم حکمراں کی مدت کے بعد ہی مغلیہ حکومت کا زوال بھی شروع ہوجاتا ہے۔ مغلیہ حکومت کے امراءوسپہ سالاران جوعہد جہانگیری وشاہجہانی میں عیش وعشرت کے بھی عادی ہوچکے تھے ان میں آرام طلبی ،فرض ناشناسی اورخودغرضی جیسی قبیح خصلتیں بھی گھر کرچکی تھیں، ان میں کچھ غدار بھی پیدا ہوچکے تھے جن کی وجہ سے یہ عظیم سلطنت سمٹتی جارہی تھی اوررفتہ رفتہ یہ حکومت ڈیڑھ سوسال کے بعد ۱۸۵۷ء میں یکسرختم ہوگئی۔

خانوادۂ شاہ ولی اللہ دہلویؒ

اٹھارہویں صدی عیسوی کی ابتدا ہے اور اورنگزیب عالمگیر کی حکومت کے آخری ایّام، یہ زمانہ سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کا عہد زوال ہے، لیکن مذہبی اور علمی طور پر اصلاح وتجدید کا زمانہ، ۱۷۰۳ء کو دہلی کے ایک نامور عالم گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا، جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ اس سیاسی زوال اور حکمراں طبقے میں اخلاقی و روحانی انحطاط کے دور میں اصلاح کے ساتھ علوم اسلامیہ کی سربلندی کا ذریعہ بنے اور مغلوں کا تخت وتاج اگر ختم بھی ہوتو اسلام اور قرآن وحدیث سلامت رہیں۔

یہ تھے حکیم الاسلام والامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، جلیل القدر عالم دین، مفکر اسلام اور انقلاب آفریں مصلح امت، ایک عالم دین شاہ عبدالرحیم کے فرزند ارجمند، والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم نے دہلی میں اقامت اختیار کی اور مدرسہ رحیمیہ کا آغاز کیا، آپ عالمگیری دور کے درباری علماء سے الگ تھلگ رہے، اور جب شاہ ولی اللہ سترہ سال کے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر مکتب جانا شروع کر دیا اور فارسی کتابیں پڑھیں، دس سال کی عمر میں نحو وصرف کی کتابوں کے بعد معقولات پڑھی، پھر منقولات کی جانب متوجہ ہوئے، فقہ، منطق، حدیث اور کلام کے علاوہ دیگر علوم مروجہ (طب، ریاضی، ہندسہ وغیرہ) اپنے والد سے پڑھیں اور جب والد

کا انتقال ہوا تو سترہ سال کی عمر ہی میں مسندِ تدریس سنبھالی، مدرسہ رحیمیہ میں علوم دینیہ وعقلیہ کی تعلیم دی۔ اسکے بارہ سال کے بعد آپ حرمین شریفین تشریف لے گئے، مقصد حج وزیارت تھا، مگر وہاں ایک نابغۂ روزگار محدث شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی سے حدیث کا درس لیا اور سند حاصل کی، کئی سال کے بعد استاذ سے اجازت لی اور وطن واپس لوٹے تو یہاں دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ مغلیہ حکومت پر زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، مختلف علاقے کی مختلف اقوام بغاوت اور خوں ریزی پر اتری ہوئی تھیں، مرہٹے، سکھ، سادات بارھہ، نادر شاہ سب ہی ملک وقوم کی تباہی میں پیش پیش تھے، یہ تمام خونیں ڈرامے حضرت شاہ ولی اللہ کی زندگی میں ان کے سامنے ہورہے تھے، اور شاہ ولی اوران کا خاندان، علماء ومشائخ کے اس طبقے سے یکسر جدا تھا جو عالمانہ یا صوفیانہ مشاغل میں اسطرح مستغرق ہوجاتے ہیں کہ دنیوی ماحول سے انھیں کوئی مطلب نہیں رہتا۔

ایک طرف آپ کے دل میں بربادئ وطن کا درد تھا تو دوسری طرف آپ اسبابِ مرض اور علاج کی جستجو میں رہتے، ان حالات میں آپ نے اصلاحی جدوجہد شروع کی، اس کیلئے آپ نے اصلاحی نظریات بھی مرتب کئے، جن کی تفصیل کا یہ نہ موقع ہے اور نہ اس کی گنجائش۔ بہرصورت آپ ان تمام کوششوں میں بھی دلچسپی لیتے رہے جو حکومت اسلامی کو تباہی اور خلق خدا کو بربادی سے بچانے کیلئے کی جاتیں۔ ابھی حالات اتنے سازگار نہ تھے کہ عسکری کوششیں خود کرتے، ہاں وہ نہایت دانشمندی سے اس کیلئے موزوں افراد کو متوجہ کرتے رہے اور خود کو اس کام کیلئے وقف کردیا جس کے لئے امت کو ان کی ضرورت تھی، یعنی دینی، مذہبی اور علمی امور پر توجہ۔ پھر آپ نے دینی علوم کی اشاعت کیلئے خود کو مشغول کرلیا، حدیث کی تدریس کے علاوہ قرآنی علوم اور احادیث کی تشریح پر تصنیف وتالیف کا

سلسلہ جاری کر دیا۔ اور بلاشبہ دینی اور علمی میدان میں ان کی خدمات کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ برصغیر ہند میں اسلامی علوم کی نشأۃ ثانیہ انھیں کی بدولت ہے۔ ان کی تبحر علمی، ذکاوت، تقویٰ، اشاعتِ کتاب وسنت کی وجہ سے اور برصغیر میں دینی علوم کی ترویج کیلئے ان کو ''امام'' کا درجہ حاصل ہے۔

جب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ولادت ہوئی تو ہندوستان کی مسلم حکومت اپنے انتہائی عروج پر تھی اور جب وفات ہوئی تو ملک کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی، مگر ان کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان کے جانشین ہو چکے تھے اور اپنے والد کی علمی وسیاسی تحریک کو برقرار رکھا تھا، تعلیم وتربیت اور نشر واشاعت کا سلسلہ ہندوستان کے ہر ہر خطے تک پہونچ چکا تھا، درس وتدریس بھی جاری تھی، تربیت روحانی بھی تھی اور تقاریر کا سلسلہ بھی، ان سے فیض پانے والوں کی اتنی بڑی جماعت تیار ہوگئی تھی جو وقت کے تقاضے کے مطابق ہر میدان میں امت کی قیادت کرنے کی اہل تھی، ان میں نمایاں نام حضرت شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی، (فرزندان شاہ ولی اللہ) شاہ محمد اسحاق (محدث شاہ عبدالعزیز کے نواسے) شاہ اسماعیل شہید (خلف شاہ عبدالغنی)، سید احمد شہید، مولانا رشید الدین، مفتی صدرالدین دہلی وغیرہ کے ہیں۔

(تاریخ ملت سوم، علماء ہند کا شاندار ماضی، رودکوثر)

مغلیہ حکومت کا خاتمہ

اور

بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات

اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہوتا ہے، راجپوتوں اور سکھوں نے بغاوت کی، مقابلہ آرائی ہوئی، ایک بغاوت ختم ہوئی تو کسی اور جگہ سے دوسری بغاوت کی خبر آنے لگی، اِدھر مسلمان امراء میں بھی تفرقہ شروع ہوا، دوفریق نمایاں تھے ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے تو اسلامی حکومت کی جڑیں ہلا دیں، پھر یکے بعد دیگرے حکمراں آتے رہے اور ہندوستان کے علاقے ان کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ اورنگزیب کے پوتے فرخ سیر کے زمانے میں تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی راہداری کا پروانہ مل چکا تھا، پھر ۱۷۵۷ء میں پلاسی کا معرکہ ہوا اور بنگال کمپنی (انگریز) کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اِدھر مرہٹوں نے ''شاہ گری'' کا کام شروع کر دیا، کسی کو معزول کیا تو کسی کو تخت پر بٹھا دیا، اور اُدھر انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت ختم کر کے دہلی پر اپنے آلۂ کار حکمرانوں کو بٹھا دیا، بالآخر ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک بادشاہ سلامت مغل خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور وہ دہلی میں تخت نشیں رہے۔

پھر شروع ہوتا ہے بغاوت ۱۸۵۷ء کا دور، ہندوستانی باشندوں کا اپنے ملک سے غیر ملکی طاقت (انگریز) کو ہٹانے کا عزم اور اسکے لئے حکمراں انگریز کے خلاف بغاوت کا سلسلہ، جس میں مسلح، منظم اور طاقتور انگریزی حکمرانوں کے مقابلے برصغیر کے مسلم، ہندو اور دوسری قوموں کی غیر منظم، کمزور اور ناکام کوشش، اور منطقی انجام بغاوت کی ناکامی اور اس کو نام دیا گیا غدر کا، بادشاہ سلامت کو جلاوطنی کی سزا، شہزادوں کا قتل، اور اس بغاوت کے رہنماؤں کا قتل عام، لوٹ مار، خوں ریزی اور پبلک مقامات پر پھانسیاں۔

اس ناکام بغاوت کے بعد جن افراد پر تحریکِ غدر میں شامل ہونے کا شبہ ہوا یا مخبری کی گئی ان میں بیشتر کو پھانسی دے دی گئی یا وہ روپوش ہو گئے، ان لوگوں میں وہ علماء و مشائخ بھی تھے جو مغربی یوپی میں مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے، میرٹھ، سہارنپور، تھانہ بھون، بلند شہر اور علی گڑھ کے مجاہدین اور علماء حق۔

تحریکِ آزادئ ہند

ملک کی جدوجہد آزادی کی یہ پہلی منظم اور عوامی تحریک تھی جس کی ابتدا میرٹھ سے ہوئی اور بلاشبہ جس کے قائدین میں جنرل بخت جیسے عالی ہمت افراد کے علاوہ علماء دین بھی تھے جن کا تعلق شمال کے اسی خطے سے تھا، اور گو کہ اس میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم ہندوستانیوں نے بھی جوش و خروش کے ساتھ دیا اور ناکامی کی صورت میں ان کا قتل عام ہوا مگر حقیقت میں انگریز حکمرانوں نے یہ باور کرلیا تھا کہ یہ اسلامی جہاد ہے اور مسلمان ہی اس کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، اسلئے اس قتل عام اور انتقامی جنون کے شکار سب سے زیادہ مسلمان ہی ہوئے، دہلی اور اطراف، خاص طور پر ضلع میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور کے مسلمان اور علماء دین۔

اس تحریک بغاوت کو تقویت دینے اور عملی طور پر اس میں حصہ لینے والوں میں

علماء کی ایک جماعت نمایاں تھی جس کے سربراہ اور امیر حاجی امداد اللہ تھانوی (مہاجر مکی) تھے اور ان کے دست راست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ محمد تھانوی، حضرت حافظ ضامن شہید وغیرہ تھے، جنھوں نے معرکۂ شاملی وتھانہ بھون میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب مئی ۱۸۵۷ء کی یہ بغاوت ناکام ہوگئی تو اس جماعت علماء کو بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننا پڑا، حافظ ضامن نے جام شہادت نوش کیا، حضرت گنگوہی جیل گئے، حضرت نانوتوی روپوش ہوئے اور امیر کارواں مکہ معظّمہ ہجرت کر گئے۔

غرض کہ اس جہادِ حریت اور انقلابی کوشش کی قیمت سب سے زیادہ مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی اور انگریزی حکومت کے ذمہ داروں نے یہ سمجھا کہ مسلمان ہی اس بغاوت کے ذمہ دار ہیں، اس لیے ان کی آئندہ نسلوں کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اور جب دسمبر ۵۷ء کے اخیر تک انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت پر اپنا تسلط قائم کرلیا اور اپنی انتقامی کارروائیوں اور خوں ریزیوں سے تمام ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمانوں کو شکست و مایوسی کے غار میں دھکیل دیا تب برصغیر ہند پر اپنی حکومت کی بالادستی قائم کرنے اور طویل عرصے تک یہاں رہنے کیلئے منصوبہ بندی شروع کی، سب سے پہلے تعلیم پر انگریزوں کی پالیسی شروع ہوئی جو یہ تھی کہ عام طور پر لوگوں کو ناخواندہ رکھا جائے۔ ۲-مسلمانوں کو عیسائی بنایا جائے۔ ۳-ہندوستانیوں کو لامذہب بنایا جائے۔ پہلی دو پالیسیوں پر یکے بعد دیگرے عمل ہوتا رہا مگر وہ ناکام رہیں، گرچہ ان سے بھی باشندگان ہند کو بہت نقصان اٹھانا پڑا، مگر اب وہ پالیسی نافذ کی جانے لگی جس سے اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی ثقافتی ودینی شناخت ختم ہوسکے، یہاں ''لارڈ میکالے'' کی رائے پیش نظر رہے:

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون ورنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق اور فہم کے لحاظ سے انگریز ہو۔"

اس پالیسی کا حاصل یہ تھا کہ برطانوی شہنشاہیت کے وفادار غلام پیدا کیے جائیں اور مسلمانوں کو ان کے دین ومذہب سے لاتعلق کر دیا جائے۔

اسی دوران انگریزوں نے عیسائی پادریوں کی مدد سے پورے ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور عیسائیت کے غلبے کی مہم جاری رکھی۔ مسلمان شکست خوردہ تھے، سیاست کے نام پر تحریک ان کے لیے دشوار، کیوں کہ قوم میں تنظیم ہی نہیں رہ گئی تھی، ایسی صورت میں اسلام کی بقاء، علوم دین کی حفاظت اور مسلمانوں کے تحفظ کی کیا صورت ہو؟

اس عظیم تر مقصد کیلئے چند نفوس قدسیہ نے طے کیا کہ مذہب اور دین کی بقا کیلئے تعلیم کی راہ اپنائی جائے اور خالص غیر حکومتی دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ پھر خاندان ولی اللہ دہلوی کے جانشینوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے روحانی فیض یافتہ برگزیدہ اشخاص نے بتوکل علی اللہ دیوبند میں ایک "عربی مدرسہ" کی بنیاد ڈالدی اور اسی طرز پر سہارنپور، مرادآباد اور دیگر مقامات پر مدارس کی ابتدا ہوگئی جس کا نعرہ تھا: "ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔"

دیوبند کا یہی "عربی مدرسہ" الجامعۃ الاسلامیۃ دارالعلوم دیوبند کی صورت میں اسلامی علوم کا وہ مرکز عظیم ہے جس کی بدولت آج برصغیر میں نہ صرف یہ کہ اسلام کا نام روشن ہے بلکہ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں اور ان کے دین ومذہب کا سب سے بڑا اور روشن باب ہے۔ (علماء ہند کا شاندار ماضی، علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے، سوانح قاسمی، ہندوستانی مسلمان ایک جائزہ، رودکوثر)

مناسب ہوگا کہ بناء دارالعلوم دیوبند، اس کے اصول و دستور اور اس کے مسلکی مزاج پر بھی مختصر روشنی ڈالی جائے۔

دیوبند اور تاسیس دارالعلوم

دیوبند ایک قصبہ ہے، جو مغربی یوپی کے ضلع سہارنپور کی ایک تحصیل ہے، اور سلطنت مغلیہ کے زمانے سے اب تک اس کی یہی حیثیت برقرار ہے، یہ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی سے بجانب شمال تقریباً ایک سو پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ موجودہ وقت میں اس کے شمال میں ریاست اتراکھنڈ ہے۔ یہاں شہنشاہ اکبر کے عہد کا ایک قلعہ بھی موجود تھا، دیوبند میں مسلمانوں کی آبادی کا پتہ ساتویں صدی ہجری سے چلتا ہے۔ یہاں پر کچھ مسجدیں اسلامی عہد حکومت کی تعمیر ہیں جو اب تک موجود ہیں، مسجد قلعہ سلطان سکندر لودھی ۸۹۴ھ (۱۴۸۸ء) مسجد خانقاہ اکبر کے عہد کی، مسجد ابوالمعالی اورنگزیب علیہ الرحمہ کے عہد کی یادگار ہیں۔

اسی دیوبند کے مغربی کنارے پر ایک قدیم مسجد ''مسجد چھتہ'' کے نام سے مسلمانوں کے ابتدائی طرز تعمیر کا نمونہ ہے، یہ مسجد اکثر مشائخ اور اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض رہ چکی ہے، اس کے مشرق میں ایک انار کا درخت تھا، اسی مسجد میں دیوبند کے ایک بزرگ حاجی سید عابد حسین اور مولوی رفیع الدین رہا کرتے تھے جہاں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ میرٹھ سے آکر قیام پذیر ہوا

کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب میں جب دہلی اجڑی اور اس کی سیاسی بساط الٹ گئی تو دہلی کی علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی، اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی اس شمالی خطہ سے ہجرت کر گئے تو شاہ عبدالغنی مجددی علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے فیض یافتہ مشائخ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور ان کے رفقاء نے دینی و تعلیمی تحریک کی ابتدا فرمائی۔

دیوبند میں دینی تعلیم کی ابتداء کیلئے ایک مکتب کا قیام اسی مسجد چھتہ میں ہوا اور مذکورہ بالا نفوس قدسیہ نے اسی سرزمین کو علمی مرکز کیلئے منتخب کیا، ان علماء کبار اور مشائخ عظام نے سربراہ جماعت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سرکردگی میں دیوبند میں ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ ''عربی مدرسہ'' (دارالعلوم دیوبند) کی بنیاد ڈالدی۔ جو حضرات قیام دارالعلوم میں شریک رہے وہ یہ تھے:

۱-حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
۲-حضرت حاجی سید عابد حسین دیوبندی
۳-حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی
۴-حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی
۵-حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی
۶-حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی

اس طرح اس علمی تحریک کی ابتدا ہوئی جو تحریک دیوبند کے نام سے جانی جاتی ہے اور جس کی ظاہری شکل یہ عظیم الشان انقلابی درسگاہ ''دارالعلوم دیوبند'' تھی۔

بانئ دارالعلوم دیوبند نے ادارے کے لیے اصول مرتب کئے، حضرت حاجی عابد حسین نے سب سے پہلے تعاون دیا اور چندے کیلئے اپیل کی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حجر اساس رکھنے میں شریک ہوئے، رفقاء نے انتظامات سنبھالے، اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے مکہ معظّمہ میں اس ادارے کیلئے دعائیں کیں، حضرت گنگوہیؒ نے سرپرستی فرمائی، اس طرح ایک ایسی دینی درسگاہ کی بنیاد پڑی جو ولی اللٰہی علمی مرکز کا عکس تھی۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کیلئے عمل میں لایا گیا ان کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستور اساسی میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

۱-قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات پہنچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲-اعمال واخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳-اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع اور اشاعت اسلام کی خدمت بذریعہ تقریر وتحریر بجالانا، اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ سے خیر القرون اور سلف صالحین جیسے اخلاق واعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴-حکومت کے اثرات سے اجتناب واحتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵-علوم دینیہ کی اشاعت کیلئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند)

اصول ہشت گانہ
بانئ دارالعلوم دیوبند

(۱) تامقدور کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں اور دوسروں سے کرائیں، خیراندیشان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے۔

(۲) بقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیراندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اورخوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی کہ اہل شوریٰ کو اپنی مخالفت رائے اوراوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوتو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔ اوراس لیے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں، سامعین اس کو بہ نیت نیک سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدِل وجان قبول کرینگے۔ اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ مہتمم امورمشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہوں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیراندیش ہو، نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے کسی اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئی اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے

مشورہ کیا گیا ہوتو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ بات نہایت ضروری ہے کہ مدرسین باہم متفق المشرب اور مثل علماء روزگار خودبیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئیگی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگیٔ مقرّرہ اسی انداز سے جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز جو مشورے سے تجویز ہو پوری ہوجایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(٦) اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ مدرسہ انشاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائیگی، کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائیگا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بےسروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امیدِ ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب معلوم ہوتا ہے۔

مسلک دارالعلوم دیوبند

برصغیر کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد مجاہدین کے ذریعہ ہوئی، اوراس کی اشاعت بھی۔ مگر اشاعتِ اسلام میں بڑا حصہ صوفیاء کا بھی رہا ہے، چنانچہ صوفیاء کی جماعت مسلم عہد حکومت میں ہمیشہ رہی، ان کے سلسلے بھی مختلف ہوئے، کچھ پابند شرع اور کچھ ''طریقت'' کے نام پر شریعت سے متجاوز یا منحرف، دینی علوم کی اشاعت اوراصلاحِ باطن کیلئے مدارس بھی قائم ہوئے اور خانقاہیں بھی، دعوت وتبلیغ، درس وتدریس اور ظاہری و باطنی تربیت دونوں جماعتوں نے کی، علماء نے بھی اورصوفیاء نے بھی، عام طور پر علماء کی کفالت حکومت نے کی اورصوفیاء گوشہ نشین رہے، ہر دور میں علماء حق بھی رہے اور علماء سوء بھی، متصوفین پابند شرع بھی رہے اورصوفیائے طریقت بے شرع بھی۔ ایک دوسرے سے مباحثے بھی کئے اور مناظرے بھی، کچھ اس طرح جیسے اہل اسلام غیر ادیان کے ماننے والوں سے کریں، اس کی واضح مثال عہد اکبری کے درباری مباحثے اورمناظرے ہیں۔ اس کے بعد بھی یہ صورتحال برقراررہی۔

مگر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں علماء حق رہے اور اصلاح وتربیت کے علمبردار بھی، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس کی زندہ مثال ہے۔ اوران کے جانشین یا معاصر جیسے حضرت محدث عبدالحق دہلوی اوران کے خلفاء وتلامذہ، دین کی تعلیمات عام کرنے، قرآن وسنت کی تعلیم وتبلیغ میں سرگرم

رہے، اور اصلاح باطن میں بھی، یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے افراد خاندان وتلامذہ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں اسلامی علوم وفنون کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، خاص طور پر علوم قرآنی وعلوم حدیث کو۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان علماء حق نے تعلیم وتربیت کے ساتھ اصلاح باطن اور راہ سلوک کا دامن نہیں چھوڑا، اگر علماء وقت سے قرآن وحدیث یا فقہ کی تعلیم حاصل کی تو مشائخ وقت سے اصلاح باطن کا رشتہ بھی جوڑا۔ اور حالات کے تقاضے کے تحت علماء معقولات سے منطق وفلسفہ اور علم کلام میں فیض حاصل کیا، پھر برصغیر کے مسلمانوں میں ہر فرقے اور مکتب فکر کی جماعت رہی، شیعہ بھی اور سنی بھی، شیعوں کے مختلف فرقے تو سنیوں کی کئی جماعتیں۔ سنی حضرات کے نمایاں مکاتب فکر کی بھی مختلف جماعتیں، مگر ہر ایک کا دعویٰ کہ وہ ''اہل سنت والجماعت'' ہے، حنفی المذہب مسلمانوں میں دو طبقے معروف ہیں، دیوبندی المسلک اور رضاخانی (بریلوی) مسلک، بریلوی حضرات تو سینہ تان کے اور خم ٹھونک کے اعلان کرتے ہیں کہ وہ اہل حق اہل سنت والجماعت ہیں، اصحاب دیوبند بھی اہل سنت والجماعت کے علمبردار ہیں، اور غیر مقلدین حضرات جو خود کو اہل حدیث کہلانا پسند کرتے ہیں (اور پٹرول کی اہمیت کے بعد ''سلفی'' لکھتے ہیں) ان کا دعویٰ ہے کہ وہی حق پر ہیں اور قرآن وسنّت کے پابند۔

ان تینوں مکاتب فکر کا سلسلۂ علم وسند حضرت شاہ ولی اللہ تک پہونچتا ہے۔ برصغیر کی یہ تین نمایاں جماعتیں ہیں جو بہر حال شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے علوم وفیوض کی رہین منت ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ کے زمانے تک علوم دینیہ کے ساتھ سلوک وتصوف کا امتزاج پایا جاتا ہے، اب ایک جماعت نے تو تصوف کو لغو، باطل یا افیم تک قرار

دے دیا اور دوسری جماعت نے صوفیاء کے درجات غوث، قطب، ابدال کے القاب کے ساتھ طریقت کو ہی دین کا جزو اعظم بنا دیا۔ مگر ایک راستہ اعتدال کا تھا، شریعت اور علوم شریعت کو اہمیت دینا، اور سلوک کو صرف باطنی اصلاح کا ذریعہ بنانا۔ یہی وہ مسلک تھا جو حقیقتاً اہل سنت والجماعت کا ہوسکتا تھا، اور یہی ہے وہ ''مسلک دیو بند'' جو اہل حق کے مسلک کی نمائندگی کرتا ہے، اس میں دیو بند کا الحاق صرف اس وجہ سے کہ علماء ومشائخ دیو بند اس پر قائم رہے اور اسے اپنا نصب العین بنایا۔

مشمولات:

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی وفات کے بعد مختلف مواقع پر تحریر کیے گئے مضامین، مطبوعہ وغیر مطبوعہ، اُن کی حیات کے بیشتر گوشوں پر مشتمل تحریریں، البتہ غیر ملکی اسفار کی تفصیلات، خطابات، ومواعظ وغیرہ اس میں شامل نہیں، وہ حصہ نمایاں کیا گیا ہے جو دارالعلوم دیوبند سے متعلق ہے۔

اور چونکہ مضامین الگ الگ موقعوں پر تحریر کیے گئے تھے اس لئے تمہیدات یا تفصیلات میں تکرارِ مضامین کا امکان واحتمال موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام
اور
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

انگریز حکمرانوں کی تعلیمی پالیسی کے علی الرغم چند نفوس قدسیہ نے طے کیا کہ مذہب اور دین کی بقا کیلئے تعلیم کی راہ اپنائی جائے اور خالص غیر حکومتی دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا جائے۔ پھر خاندان ولی اللہ دہلوی کے جانشینوں اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے روحانی فیض یافتہ برگزیدہ اشخاص نے بتوکل علی اللہ دیوبند میں ایک ''عربی مدرسہ'' کی بنیاد ڈالدی اور اسی طرز پر سہارنپور، مرادآباد اور دیگر مقامات پر مدارس کی ابتدا ہوگئی اور جس کا نعرہ تھا:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے اسلامی ہوں۔''

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء اکابر علماء نے جس عربی مدرسے کی بنیاد رکھی وہ اس علمی تحریک کا آغاز تھا جسے دیوبند کی علمی تحریک سے معنون کیا جاتا ہے، اور جس نے اسلامیانِ ہند کو اپنے دین، عقیدہ و ایمان اور اسلامی وجود کے تحفظ کے لیے ایک نئی جہت عطا کی، پھر ملک کے مختلف علاقوں میں

اس طرح کے دینی مدارس کے قیام کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو نہ صرف کتاب وسنت اور علوم اسلامیہ کی تدریس کے مراکز بنے، بلکہ ملک کی جدوجہد آزادی کی بنیاد بھی بنے۔

دیوبند کا یہ ''عربی مدرسہ'' دارالعلوم دیوبند بنا اور ان نفوس قدسیہ کے اخلاص ومحنت کو اللہ نے غیر معمولی قبولیت سے نوازا، ادارہ ترقی کرتا رہا، طالبان علوم دینیہ کا رجوع بڑھتا گیا، رفتہ رفتہ اس علمی ودینی مرکز سے دین کی ہمہ جہت خدمات کیلئے ایسے افراد تیار ہوئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے زرّیں ابواب ہیں، حلقۂ دیوبند کی فخرِ روزگار اور اساطینِ علم وفضل شخصیتوں کی تعداد اور ان کی خدمات کا ذکر ہزاروں صفحات بھی یکجا نہیں کرسکتے، یہاں صرف ایک ایسی شخصیت کا سرسری تذکرہ مقصود ہے جو جامع الصفات اور مختلف النوع صلاحیتوں کی مالک ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے علمی ونسبی جانشین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ مہتمم دارالعلوم دیوبند، جنھوں نے اس عربی مدرسہ دارالعلوم کو ''الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم دیوبند'' کے عالی مقام تک پہونچادیا، دیوبند کی اس علمی تحریک کو ملک گیر پھر عالمگیر بنادیا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

حضرت مولانا محمد طیب رحمہ اللہ، نانوتوی خاندان کے علمی ودینی ماحول میں ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء پیدا ہوئے، تاریخی نام ''مظفرالدین'' قرار پایا، ان کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ کا قاری صاحب کی ولادت سے دوسال قبل ہی فقیہ الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (سرپرست دارالعلوم دیوبند) نے دارالعلوم کے اہتمام کے لیے انتخاب فرمایا تھا، تعلیم وتربیت کے لئے خالص دینی وعلمی ماحول میسر آیا، سات سال کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کئے گئے، دوسال

میں حفظ قرآن اور قرأت و تجوید سے فراغت ہوگئی، پھر فارسی اور ریاضی کے درجات میں تعلیم مکمل کر کے عربی درجات میں داخل ہوئے، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے دارالعلوم کے اساتذہ نے تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند میں ''تحریک ریشمی رومال'' کے سربراہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ آزادیٔ وطن کے لئے قیادت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کے زیر سایہ حضرت مولانا محمد طیبؒ پروان چڑھے، اور حدیث کا علم علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ سے حاصل کیا، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن اور والد محترم مولانا حافظ محمد احمدؒ سے بھی تعلیم پائی، ۱۳۳۷ھ (۱۹۱۸ء) میں دارالعلوم سے فراغت پائی اور اعزازی طور پر دارالعلوم میں تدریس سے وابستہ ہوگئے، ارادت وعقیدت کا تعلق حضرت شیخ الہند، علامہ کشمیریؒ اور پھر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ سے قائم کیا، ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ اہتمام میں ہی دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کی تجویز و تائید سے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے نظم و نسق کی نگرانی کے لیے نائب مہتمم بنائے گئے، چند سالوں میں انتظام و انصرام اور دارالعلوم کے شعبہ جات کے جملہ امور سے واقفیت ہوگئی اور مہتمم اعلیٰ حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو باتفاقِ مجلس شوریٰ و اکابر علماء دیوبند مستقل طور پر مہتمم بنائے گئے، اور اخیر عمر تک اس عہدے پر فائز رہے، اہتمام کو ایک نئی جہت دی اور دارالعلوم دیوبند کو عالمی سطح پر متعارف کرایا، اس طرح کہ دارالعلوم دیوبند اور حضرت حکیم الاسلام ایک دوسرے کے جز بن گئے، دارالعلوم کے ذکر کے ساتھ

حضرت قاری طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا تصور ابھرتا اور حضرت مہتمم صاحب کے لقب سے دار العلوم کا ذکر واضح ہوتا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمۃ کی نیابتِ اہتمام کے دور سے ان کی رحلت تک ساٹھ سال کا ایک طویل عرصہ ہے جس میں انھوں نے دار العلوم کی مکمل قیادت کی اور مسلمانان ہند کے اس دینی، تعلیمی اور تبلیغی مرکز کی تعمیر وترقی کا کام نہایت عروج پر پہونچا دیا، جس کا اعتراف ایک تاریخی حقیقت ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی، آزادی کی تحریک زوروں پر تھی، حکمراں طبقہ ہر اس تنظیم اور ادارے نیز شخصیات کی قبولیت و مرجعیت ختم کردینے کے درپے تھا جس سے مخالفت ہوتی یا جس سے اقتدار اور تسلط کو خطرہ ہوسکتا تھا، اور دار العلوم دیوبند کو بجا طور پر مسلمانوں کے دینی وروحانی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اس لئے بارہا اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس کے نظم ونسق میں کسی طور پر مداخلت کی کوئی صورت بن سکے مگر حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دانشمندی، حکمت وتدبر سے دار العلوم کو اس طرح محفوظ رکھا کہ اس میں سیاسی مداخلت نہ ہوسکے، تعلیم وتبلیغ اور اشاعت علومِ قرآن وحدیث کی خدمت یکسوئی کے ساتھ جاری رہی، پھر دار العلوم کو حکومت کی طرف سے مالی امداد وتعاون کی پیش کش کی گئی، مگر بانئ دار العلوم کے الہامی اصولوں پر پابندی اور حضرت مہتمم صاحب کی حکیمانہ قیادت کا اثر تھا کہ اس طرح کے تمام راستے مسدود کردیے گئے، جس سے ادارے کی آزادی وخودمختاری کو کوئی خطرہ پیش آسکتا تھا، ہندوستانی مسلمان اپنے تعاون اور مالی امداد سے ادارے کی خدمت کرتے رہے، مگر جب وطن کو آزادی ملی اور ملک کے دو حصے ہوگئے اس وقت دار العلوم دیوبند کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بڑے بڑے اصحابِ ثروت معاونین پاکستان چلے گئے اور

دارالعلوم سے وابستہ بہت سے ماہر اساتذہ وشیوخ بھی ہندوستان چھوڑ گئے، اس صبر آزما دور اور مشکل حالات میں بھی حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم دیوبند کے کردار اور خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دی، اس کی تعمیر وترقی اور اس کی توسیع کے لیے ہر ہر طرح سے کوشش کی اور خدا کا فضل اس طرح شامل رہا کہ دارالعلوم مزید ترقی کرتا گیا، دارالعلوم دیوبند کی تعمیر وترقی، اس کی خدمات کا تعارف اور مسلک اکابر دیوبند کی ترجمانی کے لیے حضرت حکیم الاسلام کے اسفار اور تقریری پروگرام، ملک وبیرون ملک تبلیغی ودعوتی دورے اس ساٹھ سالہ دور اہتمام کی ایک عظیم الشان خصوصیت ہے۔

دیوبند میں قیام کے دوران حضرت رحمۃ اللہ علیہ، دارالعلوم کے تمام شعبہ جات کی کارکردگی پر نظر رکھتے، اس کی توسیعی خدمات کے لئے جدوجہد فرماتے اور جب دیوبند سے باہر سفر پر ہوتے تو دارالعلوم کے دیگر مقاصد کی تکمیل فرماتے جس میں تبلیغ ودعوت اور اصلاح معاشرہ کے اعلیٰ مقاصد بھی شامل تھے، حضرت کے ملکی وغیر ملکی اسفار ایک ایسا عنوان ہے جس پر تفصیلی بحث کا مطلب ہے ایسی تاریخ مرتب کرنا جو برصغیر کے علاوہ پورے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک کے سیکڑوں اسفار، تقاریر اور اجتماعات میں شرکت پر مشتمل ہو جو دراصل دارالعلوم کے نصب العین اور مسلک دیوبند کے تعارف اور علماء دیوبند کی سرگرمیوں کی اشاعت کے ذریعے تھے۔

وہ دینی تحریک جو دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے شروع ہوئی اور ''مسلکِ دیوبند'' سے متعارف ہوئی جس کا مقصد احیاءِ علوم دین، بقائے عقائد اسلامی اور اشاعتِ علومِ قرآنی تھا، وہ کسی خاص علاقہ، ملک یا جماعت تک منحصر نہیں تھا، یہ تحریک حضرت حکیم الاسلامؒ کے ذریعہ عالمگیر بن گئی، اور یہ ادارہ بین الاقوامی دینی

مرکز کی حیثیت سے معروف و مستند ہوا اور اس مسلکِ دیوبند کے ترجمان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ایسے قائد کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی، اور اس کی وجہ حضرت کا حسنِ نیت، اخلاص، عمل، عبقری صلاحیت، تقریر و تحریر کی نادر مہارت اور ان کی شخصی خوبیاں ہیں، اس وجہ سے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں میں دینی رہنما و قائد کی حیثیت سے ان کی شخصیت سب سے ممتاز اور نمایاں رہی ہے، اور پورے برصغیر میں امت کے مرجع بنے رہے۔

اس لئے جب ہندوستان میں بلا تفریق مسلک تمام مسلمانان ہند کی تنظیم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا قیام ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا تو متفقہ طور پر ان کو صدر منتخب کیا گیا اور اخیر عمر تک اس منصب کو اپنی صلاحیتوں سے زینت بخشی، تمام جماعتوں، مسالک اور تنظیموں کے علماء و سربراہان ان کی قیادت سے مطمئن رہے۔

ان تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا خود ایک عظیم کارنامہ ہے جو حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات سے منسوب ہے، بیحد مشغولیات اور اسفار کی کثرت کے باوجود ایک نمایاں وصف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف و تالیف اور مقالات و مضامین لکھنا بھی ہے، سفر یا حضر کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ بہت سے مضامین اور مقالے دوران سفر ہی انجام پاتے، دوران سفر ٹرین میں بیٹھ کر کسی مضمون کو مکمل کر لینا تو ان کی انفرادیت رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اتنی مصروفیات، تقریری پروگرام اور اسفار کے باوجود مختصر اور طویل مضامین کے علاوہ کتابوں کی تالیف انکا عظیم الشان کارنامہ ہے، اور ان تصنیفات میں اسرار دین، حکمت، قرآن وحدیث سے دلائل اس طرح موجود ہیں کہ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، محدث زماں علامہ انور شاہ کشمیری اور مجدد ملت حضرت تھانوی علیہم الرحمہ کے علوم کے جامع اور ان کے

روحانی جانشین تھے۔

ان کے مضامین اور تصانیف کے علاوہ ان کی تقریروں پر مشتمل مجموعہ ''خطبات حکیم الاسلام'' دس جلدوں میں شائع ہو چکا ہے جو دین وشریعت کے مختلف عنوانات پر دعوت وتبلیغ، موعظت وحکمت اور اصلاح معاشرہ کے لئے ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، علماء دین، طلبۂ مدارس اسلامیہ اور عام مسلمانوں کے لیے ایک ذخیرہ بیش بہا ہے۔

علوم اکابر دیوبند اور مسلک دیوبند کے ترجمان حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ رجولائی ۱۹۸۳ء دیوبند میں ہوئی اور مزار قاسمی میں مدفون ہوئے۔

تغمدہ اللہ بغفرانہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تحریک

دارالعلوم دیوبند

اور

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

برصغیر ہند میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی، ان کے دین وعقائد، عبادت گاہوں اور تہذیب وتمدن کو تحفظ حاصل رہا، مغلوں کے دور حکومت میں خاص طور پر اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمہ کے دور میں دینی علوم تفسیر وحدیث اور فقہ کو عروج ملا، حکومت کی نگرانی میں بھی علوم دینیہ کے نشر واشاعت کو فروغ ملا، مگر جب مغل دور حکومت کے آخری ایام میں خود حکومتیں متزلزل رہیں اور آپسی اختلافات یا اقتدار کی جنگ میں حکمراں طبقے کے افراد اور حکومت غیر مستحکم ہو گئے، اتنے بڑے ملک کا نظم ونسق بھی ان کے تسلط سے باہر ہو گیا اور خارجی ریشہ دوانیاں اور سازشیں جڑ پکڑنے لگیں تب اسلامی علوم وفنون کی حفاظت اور دینی علوم کی نشر واشاعت حکومت کی سرپرستی سے نکل گئی، بااثر افراد یا اصحاب ثروت مسلمانوں کے طبقے نے علماء دین اور علوم دینیہ کی سرپرستی کا ذمہ سنبھالا، دوسری طرف دہلی میں قرآن وحدیث کی اشاعت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خانوادے کی مخلصانہ جدوجہد سے عام ہوئی، اور تعلیم وتدریس کا یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

پھر جب برصغیر پر برطانوی استعمار کا تسلط ہوا تو محب وطن جانبازوں کے ساتھ علماء دین نے بھی حکومت کے خلاف بغاوت اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں مکمل حصہ لیا، مگران افراداور جماعتوں کی یہ کوشش ۱۸۵۷ء میں اس حد تک ناکام ہوگئی کہ انگریزوں نے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، لیکن جدوجہد آزادی کے جذبے کو ختم نہ کرسکی، حالات کو دیکھتے ہوئے استعماری حکمرانوں نے اپنی تہذیب وتمدن، علوم وادب اور طریقۂ معاشرت کو ہندوستانی عوام اور خاص طور پر مسلمانوں پر مسلط کرنا شروع کردیا، مسلمانوں کو اپنی بقاء کے ساتھ دین کی حفاظت علوم دینیہ کی اشاعت کے سارے راستے مسدود نظر آنے لگے۔

اس لئے ان نظریاتی افکار کے خاتمے اور دین وعقائد کی حفاظت کے لئے علماء کی ایک جماعت نے دینی تحریک کا ایک نیا انداز شروع کردیا۔ یہ تحریک دراصل برصغیر میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی بنیاد بن گئی، اس تحریک کی علامت تھی پورے ملک میں دینی مدارس کا قیام۔ اس تحریک کے روح رواں وہ افراد تھے جنھوں نے شاہ عبدالغنی مجددی علیہ الرحمہ سے علم حدیث حاصل کیا تھا، اس تحریک کی ظاہری ابتداء ''دیوبند'' کے ایک عربی مدرسہ کی بنیاد سے ہوئی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ نے اپنے رفقاء علماء دین کی ایک منتخب جماعت کے ساتھ اس کی بنیاد رکھتے ہوئے یہ باور کرادیا کہ علوم دین، عقائد، تہذیب اور اسلامی شعائر کے بقاء اور اس کی اشاعت کے لئے اس طرح کی دینی درسگاہیں انگریزی علوم وتہذیب کا مقابلہ کرنے کی دوسری طرف عصری علوم سے مزین ہوکر ارباب اقتدار کے شانہ بشانہ چلنے کی تحریک علی گڑھ سے شروع ہوگئی، جس کے میر کارواں سرسید احمد خاں تھے۔

دیوبند کا یہ خالص دینی مدرسہ جو بعد میں دارالعلوم کے نام سے معروف ہوا دراصل ایک تحریک تھی جس کا مقصد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اوران کے

خانوادے سے جاری فیضان علم کو باقی وجاری رکھنا اور ہندوستانی مسلمانوں کومغربی تہذیب اوراس کی خرافات سے محفوظ رکھ کر اسلامی، دینی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی مخلصانہ جدوجہد اورحسن نیت وعلم سے ادارے میں ترقی شروع کی اوراپنے مقاصد میں اس طرح کامیاب ہوا کہ پوری دنیا کو ہر شعبۂ حیات کے لیے افراد مہیا کیے، مفسر قرآن، محدث، فقیہ، مفتی، مؤرخ، عامل شریعت، مصنف، مؤلف، صحافی، ادیب اور مبلغ دین کی صورت میں ایک بڑی تعداد نے تحریک دیوبند کا نام ملک وبیرون ملک روشن کیا۔

اس ادارے کے بانیان حضرت نانوتویؒ ، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حاجی عابد حسین جیسے افراد کی نیت کا خلوص تھا کہ خدا کی توفیق بھی شامل رہی، چنانچہ اس تحریک کوافراد بھی اس طرح میسر آئے جن کے نام اسلامی تاریخ میں نمایاں ہیں، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے فیض یافتہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا یعقوب علی نانوتویؒ، مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا عبدالحق مفسر تفسیر حقانی، علامہ انورشاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ کے نام معترف عالم ہیں۔

حضرت نانوتوی علیہ الرحمہ کا لگایا ہوا یہ پودا ان کے ہی خلف اور جانشین اکابر و حامل علوم ومعارف حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کے زمانۂ اہتمام میں ایک ایسا سایہ دار تناور درخت بن گیا جس کے سائے سے مسلمان مستفیض ہوئے اوراس کے ثمر سے پورا عالم فیضیاب ہوا، اس کی شاخیں خود ایک تناور درخت بن گئیں۔

حکیم الاسلامؒ حیات وخدمات

۱۳۱۵ھ میں اس نانوتوی خاندان کے علمی و دینی ماحول میں حضرت حکیم

الاسلام کی ولادت ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند میں تحریک ریشمی رومال کے سربراہ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی دارالعلوم کی تدریس کے ساتھ آزادیٔ وطن کے لئے قیادت کے فرائض انجام دے رہے تھے، ان کی ہی تربیت اور تعلیم کے زیرسایہ حضرت حکیم الاسلام پروان چڑھے، حدیث کا علم علامۃ العصر حضرت مولانا انورشاہ کشمیریؒ سے حاصل کیا، اور حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے علاوہ خود اپنے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ سے بھی تعلیم پائی، ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور اعزازی طور پر دارالعلوم میں تدریسی وظیفے سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۳۴۳ھ میں نائب مہتمم بنے اور جب دارالعلوم کے نظم ونسق سے پوری طرح واقفیت ہوئی تو ۱۳۴۸ھ میں باتفاق علماء واکابر دیوبند مہتمم بنائے گئے اور اخیر عمر تک اس اہم عہدے پر فائز رہ کر اہتمام کو ایک نئی جہت دی، دارالعلوم کو ان کی ذات پر بجا طور پر فخر وشرف حاصل رہا۔

دارالعلوم دیوبند کو بجا طور پر مسلمانوں کے دینی وروحانی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اس لئے بارہا یہ کوشش کی گئی کہ اس کے نظم ونسق میں کسی طور پر بھی مداخلت کی صورت بن سکے، خاص طور پر دارالعلوم کو حکومت کی طرف سے مالی امداد وتعاون کی پیش کش کی گئی، مگر بانیٔ دارالعلوم کے الہامی اصولوں پر پابندی اور حضرت مہتمم صاحبؒ کی حکیمانہ قیادت کا اثر تھا کہ اس طرح کے تمام راستے مسدود کردیئے گئے جس سے ادارے کی آزادی یا خود مختاری کو کوئی خطرہ پیش آسکتا تھا۔

ہندوستانی مسلمان اپنے تعاون اور مالی امداد سے ادارے کی خدمت کرتے رہے، مگر جب وطن کو آزادی ملی اور ملک کے دو حصے ہوگئے اس وقت بھی دارالعلوم کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، بڑے بڑے اصحاب ثروت معاونین پاکستان کوچ کرگئے، دارالعلوم سے وابستہ بہت سے اساتذہ وشیوخ بھی ہندوستان چھوڑ گئے،

اس صبر آزما دور اور مشکل حالات میں بھی حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم دیوبند کے کردار اور خدمت میں کوئی کمی نہ آنے دی، اس کی تعمیر وترقی اور اس کی توسیع کے لئے ہر ہر طرح سے کوشش کی۔

اس دوران اندرونی طور پر بعض مواقع پر کچھ خلفشار بھی ہوئے، طلبہ یا اساتذہ کی جانب سے تعلیمی مقاطعوں کی صورت میں اختلافات کی صورت سامنے آئی، مگر حضرت حکیم الاسلام نے اپنے حکیمانہ تدبر، مخلصانہ شفقت اور حسن نیت و عمل سے ہر الجھن کا ازالہ فرمایا، پھر اس دور میں جب ملک میں جدوجہد آزادی کا عمل جاری تھا اور اس سے ہر طرح کے ادارے متأثر تھے حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم میں تعلیمی ماحول کو اس طرح محفوظ اور برقرار رکھا کہ اس پر سیاسی مداخلت نہ ہوسکے، تعلیم و تبلیغ اور اشاعت علوم قرآن و حدیث کی خدمت یکسوئی کے ساتھ جاری رہی، انتظامی امور کی نگرانی اور ہر شعبہ کی کارکردگی پر منصفانہ نظر حضرت مہتمم صاحب کا ایک ایسا امتیاز تھا کہ اس میں کسی جانبداری، زیادتی یا کوتاہی کا الزام عائد نہیں ہوسکتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی تعمیر وترقی اس کی خدمات کا تعارف اور مسلک اکابر دیوبند کی ترجمانی کے لئے حضرت حکیم الاسلام کے اسفار اور تقریری پروگرام ملک و بیرون ملک میں تبلیغی و دعوتی دورے اس ساٹھ سالہ دور اہتمام کی ایک عظیم الشان خصوصیت ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ جب دیوبند میں ہوتے تو دارالاہتمام میں تمام شعبوں کی کارکردگی ہر نظر رکھ کر ان کے توسیعی خدمات کی جدوجہد فرماتے اور جب دیوبند سے باہر جاتے تو اس دینی تحریک کے مقصد کی تکمیل فرماتے جس میں صرف تعلیم وتدریس ہی نہیں تبلیغ ودعوت اور اصلاح امت کے اعلیٰ مقاصد بھی شامل تھے۔

حضرت کے ملکی وغیر ملکی اسفار ایک ایسا عنوان ہے جس پر تفصیل سے بحث کا مطلب ہے ایک ایسی تاریخ مرتب کرنا جو برصغیر کے علاوہ پورے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے مختلف ممالک کے سیکڑوں اسفار، تقاریر اور اجتماعات اور مسلمانوں کے دینی حالات پر مشتمل ہو۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے یہ دورے اور اجتماعات میں شرکت اور اصلاح امت کی خاطر تقاریر دراصل دارالعلوم کے نصب العین اور مسلک دیوبند کے تعارف، علماء دیوبند کی سرگرمیوں کی اشاعت کے ذریعے تھے، جس سے پوری دنیا میں اس ادارے کا تعارف بھی ہوا اور اسے تعاون بھی ملا، ترقی کے نئے مواقع میسر آئے، جہالت وبدعت کا خاتمہ بھی ہوا۔

وہ دینی تحریک جو دارالعلوم دیوبند کے عنوان سے شروع ہوئی اور ''مسلک دیوبند'' سے متعارف ہوئی جس میں احیاءعلوم دین کے ساتھ بقائے عقائد اسلامی اور اشاعت علوم قرآنی کے عظیم مقاصد تھے وہ کسی خاص علاقے ملک یا جماعت تک منحصر نہ تھے، بلکہ یہ تحریک حضرت حکیم الاسلام کی بدولت عالمگیر تحریک بن گئی، اور یہ ادارہ بین الاقوامی دینی قلعے کی حیثیت سے ساری دنیا میں مسلم ہوگیا، اور اس کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اس تحریک کے ایسے قائد کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا جس کی نظیر ہندوستانی دینی تحریکات کے سلسلے میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی، اس کی وجہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حسن نیت، اخلاص عمل، خداداد علمی صلاحیت، تقریر وتحریر کی مہارت اور ان کی شخصی خوبیاں ہیں۔

ان ہمہ جہت خوبیوں اور صلاحیتوں کا اثر تھا کہ برصغیر ہند میں مسلمانوں میں دینی رہنما وقائد کی حیثیت سے ان کی شخصیت سب سے ممتاز اور نمایاں رہی، ان کی زندگی کے آخری بیشتر سالوں میں وہی سب کے مرجع رہے، علم وتدبر، امت میں

اتحاد کے جذبے، مثبت انداز فکر اور انفرادی اسلوب دعوت کی وجہ سے ہر مسلک ہر جماعت میں ان کو سند کا درجہ حاصل رہا، اس وجہ سے مسلم پرسنل لاء بورڈ کی صدارت میں تمام جماعتوں، مسالک اور تنظیموں کے علماء وسربراہان ان کی قیادت سے مطمئن تھے، امت اسلامیہ نے ان پر اعتماد کیا ان کو مرجع بنایا، تو حضرت اس اعتماد اور پرکھ پر ہمیشہ کامیابی سے پورے اترے، اور جہاں ان کی شخصیت کو اعتبار ملا، وہیں دارالعلوم دیوبند کے وقار اور حیثیت میں اضافہ ہوا، ان کی ذات متعارف ہوئی تو اس دینی تحریک کو مقبولیت ملی۔

خلاصہ یہ کہ ان کی ذات کی صورت میں دارالعلوم دیوبند کو منتظم، دینی تحریک کو سربراہ، امت اسلامیہ کو معتمد، مسلک دیوبند کو ترجمان، دین کو مبلغ اور قوم کو ایک کامیاب مصنّف اور خطیب ملا جنھوں نے زائد از نصف صدی ان تمام تر ذمہ داریوں کو اس حسن وخوبی سے انجام دیا کہ ان کے بعد دیوبند کی اس جماعت علماء میں اتحاد بھی برقرار نہ رہ سکا، چہ جائیکہ دینی سربراہی کا مقام مزید حیثیت کا حامل ہوتا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی اس دینی تحریک دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی مکتب فکر کی تاریخ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی عالمگیر خدمات کے اعتراف کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر قطعی نامکمل ہے۔

حکیم الاسلام
حضرت مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ
کی
حکمت ریز تصانیف اور مضامین

ہندوستان میں دین کی حفاظت، اسلامی علوم ومعارف کی اشاعت اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی وراثت میں دارالعلوم دیوبند نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ اسلامی تاریخ کے اہم ابواب ہیں، پھر علمائے دیوبند نے تفسیر قرآن، شرح حدیث، اصول فقہ، فقہ حنفی، توحید وعقائد، سیرت وآداب اور دیگر علوم وفنون میں نیز فرقِ باطلہ اور مبتدعین کے رد اور عصر حاضر کے مسائل پر جو مقالات ومضامین لکھے ہیں وہ لاتعدو لاتحصٰی کے زمرے میں آسکتے ہیں۔

ان اکابر دیوبند میں سے صرف ایک مصنف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیفات ایک ہزار کے قریب ہیں، حضرت تھانویؒ کے متعلق یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اسلامی تاریخ میں کوئی مصنف یا مؤلف ایسا نہیں گذرا جس نے قوم کی اصلاح، دعوت وتبلیغ، عقائد صحیحہ کی توسیع واشاعت میں اتنی کثیر تعداد میں کتابیں اور رسالے تحریر کئے ہوں جن کی تصانیف ہر ہر موضوع پر موجود ہے، یہاں تک کہ وہ نابغۂ علم شیخ جلال الدین سیوطیؒ سے بھی کثرت تالیف میں فائق

ہیں، البتہ سیوطی کو اپنی وسعت معلومات اور علمی تبحر میں انفرادیت حاصل ہے، حضرت تھانویؒ نے اپنے حکیمانہ دلائل ، مختلف موضوع پر تصانیف اور مواعظ وملفوظات کے ذریعہ نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بلکہ اسلامی کتب خانوں کے لئے ایک عظیم علمی و دینی ذخیرہ فراہم کردیا ہے جو ان کی اصلاحی اور دعوتی انفرادیت کونمایاں کرتا ہے۔

انھیں مصلح امت کے جانشین، خلیفۂ مجاز اور علامۃ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے ہونہار اور لائق شاگرد، اور ان کے علوم و معارف کے امین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود علوم قرآن وحدیث اور حالات حاضرہ میں اسلامی تعلیمات کی حقانیت پر کم و بیش سو تصانیف امت اسلامیہ کو دیں، اور مختلف موضوعات پر علمی، فکری، تحقیقی مضامین و مقالات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کی ابتدا حکیم الاسلام کی طالب علمی کے دور میں ہوئی اور اخیر عمر تک کے درمیانی فاصلے میں ان کے حکیمانہ قلم سے مضامین نکلتے رہے اور برصغیر ہند کے مؤقر دینی رسالوں اور اردو اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔

ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ اور مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی اہم ذمہ داری اور اس کے تمام امور سے کما حقہ عہدہ برآ ہونا بذات خود ایک ایسا کارنامہ ہے جو حضرت کی ذات سے منسوب ہے، مسلک دیوبند کے ترجمان اور دارالعلوم کے مہتمم ہونے کے ناطے دنیا بھر کے ممالک کا دورہ بھی ان کی زندگی کا نمایاں حصہ ہے، اسفار میں دعوت وتبلیغ دین کے علاوہ دارالعلوم کو دنیا بھر میں متعارف کرانا، دارالعلوم کی توسیع وترقی کے لئے جدوجہد کرنا اور مقصد دارالعلوم کو پورا کرنا بھی ان کی خدمات میں شامل ہے، اتنی مصروفیات کے باوجود سفر اور حضر

میں مختلف مقالات و مضامین لکھنا بلاشبہ حکیم الاسلامؒ کی وہ خصوصیت ہے جس نے ان کو امتیاز اور سربلندی کا اعلیٰ مقام عطا کیا تھا۔

آپ کی مضمون نگاری اور انشاء پردازی کی ابتدا زمانۂ طالب علمی میں دارالعلوم کے ترجمان ''القاسم'' کے صفحات سے شروع ہوئی، اس وقت آپ کے تحقیقی مقالے علمی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھے جاتے تھے، انشاء پردازی میں بھی آپ انفرادی حیثیت کے مالک تھے، ہندوستان اور پاکستان میں طبقۂ علماء میں بہت بلند پایہ انشاء پرداز اور مقالہ نگار موجود تھے، اس کے باوجود ملک کے مؤقر رسالے اور اخبارات ان کے مضامین کی اشاعت باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

حضرت کی دیگر خصوصیات کے علاوہ فن انشاء میں بھی ان کو خاص ملکہ تھا، سفر یا حضر کی کوئی قید نہیں ہوتی بلکہ آپ کے زیادہ تر مختصر یا طویل مقالے تو دوران سفر ہی انجام پاتے تھے، تنہائی میسر ہوئی اور قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور اس وقت تک لکھتے رہے جب تک اس مضمون کو تکمیل تک نہ پہنچا دیا، یا معتد بہ حصہ نہ لکھ دیا، کبھی کسی موضوع کو چھیڑا اور اس کے گوشے اور پہلو نکلتے گئے تو وہ کتاب کی شکل میں تیار ہو گیا، رسالوں کی فرمائش پر لکھتے تو ممکنہ حد تک مختصر مضمون کی شکل میں موضوع کے مختلف گوشوں کو سمو دیتے۔

جس طرح تقریر و خطابت حضرت حکیم الاسلام کا ما بہ الامتیاز وصف تھا اور جس کی نظیر گذشتہ صدی کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی، اسی طرح تصنیف و تالیف اور مضمون نگاری میں بھی ایک خاص رنگ تھا، اس میں علوم و عقل کی ہم آہنگی بھی ملے گی اور ظاہر و باطن کی یکجائی بھی، خدا نے انھیں علوم و حکمت سے بھرپور نوازا تھا، چنانچہ تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی اس کا رنگ نمایاں رہتا تھا، ان کی حکمت و معرفت، توضیح و تشریح، پیش نظر موضوع یا مسئلہ کے اسباب و علل، اسرار و حکم اور اطراف

وجوانب کا مکمل احاطہ کرلیتی تھی، موزوں اور باوقار الفاظ کے استعمال سے عبارت میں شیرینی اور سنجیدگی بیک وقت نظر آتی ہے، دقیق مسائل اور عبارات کو سہل اسلوب اور ترجمانی عطا کرتے، ان کی تحریر کے مطالعہ سے ذہن میں پیدا ہونے والی الجھن بھی دور ہوجاتی ہے اور شرعی امو پر حکمت اور دلیل بھی مل جاتی ہے، انھوں نے کسی خاص موضوع کو ہی نہیں اپنایا بلکہ مشکل مسائل اور پیچیدہ موضوع پر بھی لکھا، سیرت نبوی پر لکھا تو نبوت کی اعلیٰ رفعتوں کو نمایاں کیا، مسئلہ تقدیر جیسے نازک ترین مسئلہ پر قلم اٹھایا، ہر موضوع، ہر مسئلہ پر ان کا حکیمانہ رنگ غالب رہا۔

بلا شبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے علوم پر مکمل دسترس رکھتے تھے، جس کی ترجمانی اپنے انداز اور اپنی تحریر سے کی، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے نہ صرف روحانی جانشین تھے بلکہ ان کے انداز فکر، طرز استدلال، جذبۂ اصلاح وتبلیغ کے مکمل مظہر تھے، علامۃ الدہر حضرت کشمیریؒ کے شاگرد تھے تو اس شان سے کہ ان کے علوم ومعارف سے استفادہ کیا اور اسے قوم کے سامنے اپنی تقریر وتحریر سے پیش بھی کردیا، وہ بیک وقت حضرت نانوتویؒ اور علامہ کشمیریؒ کے علوم ومعارف اور حکمتوں کے وارث بھی تھے اور ترجمان بھی، منطقی طرز استدلال، علوم نقلیہ سے شواہد وبراہین کے ذریعہ اور روحانی واخلاقی طریقے سے دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کے علمبردار تھے، نابغۂ روزگار ہستیوں سے استفادہ کیا اور علم وعمل کے اسی مقام پر فائز ہوئے، خدا نے علوم وحِکم اور اسرار دین کی نعمت سے بطور وافر نوازا تھا، وہ علم وسیع، راسخ وپختہ، نگاہِ بصیر اور فکر عمیق کے مالک تھے، چنانچہ ان کی تحریروں میں یہ چیزیں بہت واضح نظر آتی ہیں اور پڑھنے والوں کے دلوں میں دینِ اسلام اور اس کی تعلیمات کی حقانیت ثبت ہوجاتی ہے۔

آپ کی تصانیف سو سے زیادہ ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہوکر اہل علم اور عام

مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرچکی ہیں ہر کتاب اسرار دین اور حکمتوں سے لبریز اور قرآن وحدیث کی روشنی میں دلائل سے مزین۔

ان کی اہم کتابیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں، یہ ہیں:

۱- التشبہ فی الاسلام
۲- تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام
۳- سائنس اور اسلام
۴- دینی دعوت کے قرآنی اصول
۵- اسلام اور فرقہ واریت
۶- ایک قرآن
۷- ملفوظات حکیم الاسلام
۸- کلمات طیبات
۹- تبرکات طیب
۱۰- مقالات حکیم الاسلام
۱۱- مکاتیب طیب
۱۲- اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام
۱۳- اسلامی مساوات
۱۴- دین وسیاست
۱۵- مسئلہ قضاوقدر
۱۶- اسباب عروج وزوال اقوام
۱۷- الاجتہاد والتقلید
۱۸- مسئلہ اردو زبان ہندوستان میں

۱۹- فطری حکومت

۲۰- شانِ رسالت

۲۱- فلسفۂ نماز

۲۲- شرعی پردہ

۲۳- علم غیب

۲۴- داڑھی کی شرعی حیثیت

۲۵- نظریۂ دوقرآن پر ایک نظر

۲۶- فلسفۂ طہارت

۲۷- آفتاب نبوت

۲۸- حدیثِ رسول کا قرآنی معیار

۲۹- انسانیت کا امتیاز

۳۰- اسلام کا اخلاقی نظام

۳۱- مقاماتِ مقدسہ

۳۲- علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج

۳۳- مشاہیرِ امت

۳۴- شہید کربلا و یزید

۳۵- فلسفۂ نعمت و مصیبت

۳۶- کلمۂ طیبہ

۳۷- حاشیۂ عقیدۃ الطحاوی

۳۸- عالمِ برزخ

۳۹- معجزہ کیا ہے؟

۴۰- آنکھ کی کہانی

۴۱- اسلام اور مغربی تہذیب

۴۲- خاتم النبیین

۴۳- اسرائیل کتاب وسنت کی روشنی میں

۴۴- جنونِ شباب

ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے مقالے، مضامین اور مختلف تحریریں کثیر تعداد میں ہیں، علمی موضوع ہو یا فکری، دینی ہو یا تاریخی، حالات حاضرہ کے مسائل ہوں یا فرق باطلہ کے پیدا کردہ شکوک واوہام، ہر موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں عقل کو بھی مطمئن کرنے کے انداز میں لکھا ہے، جو بیشتر رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں، کسی مسئلہ پر استفسار کیا گیا تو مدلل انداز میں اس کا تشفی بخش جواب بھی تحریر کیا، بہت سی کتابوں پر ان کے مقدمے بھی مستقل مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیّب

ترجمانِ مسلکِ دیوبند

برصغیر ہند کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندستان میں اسلام کی آمد مجاہدین کے ذریعہ ہوئی اور اس کی اشاعت بھی، مگر اشاعتِ اسلام میں بڑا حصہ صوفیائے کرام کا بھی رہا ہے، چنانچہ صوفیاء کی جماعت مسلم عہدِ حکومت میں ہمیشہ رہی، اُن کے سلسلے بھی مختلف ہوئے، کچھ پابندِ شرع اور کچھ ''طریقت'' کے نام پر شریعت سے منحرف یا متجاوز۔ پھر دینی علوم کی اشاعت اور اصلاحِ باطن کیلئے مدارس بھی قائم ہوئے اور خانقاہیں بھی، دعوت وتبلیغ، درس وتدریس اور ظاہری و باطنی تربیت دونوں جماعتوں نے کی، علمائے دین نے بھی اور صوفیائے کرام نے بھی۔ عام طور پر علماء کی کفالت حکومت یا اس کے افراد نے کی اور صوفیاء گوشہ نشین رہے، ہر دور میں علماء حق بھی رہے اور علماء سوء بھی، متصوفین پابندِ شرع بھی رہے اور صوفیائے طریقت بے شرع بھی۔ ایک دوسرے سے مباحثے بھی کیے اور مناظرے بھی۔ کچھ اِس طرح جیسے اہل اسلام ادیانِ باطلہ کے ماننے والوں سے کریں۔ اس کی واضح مثال عہدِ اکبری کے درباری مباحثے اور علماء کے مابین مناظرے ہیں۔ اس کے بعد بھی یہ صورتِ حال عرصۂ دراز تک برقرار رہی۔

مگر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں علماء حق رہے اور اصلاح وتربیت کے علم بردار بھی، جنھوں نے دینِ حق اور سنتِ رسولؐ کی حفاظت کیلئے ہر طرح کی قربانیاں دیں اور باطل قوتوں کے سامنے سینہ سپر رہے؛ چنانچہ حضرت مجدد الفِ ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس کی زندہ مثال ہے اور ان کے جانشین یا معاصر جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے خلفاء وتلامذہ دین کی تعلیمات عام کرنے اور قرآن وسنت کی تعلیم وتبلیغ میں سرگرم رہے اور اصلاحِ باطن میں بھی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے افرادِ خاندان وتلامذہ کا دور شروع ہوتا ہے جس میں اسلامی علوم وفنون کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے، خاص طور پر علومِ قرآن وحدیث کو۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ان علماء حق نے تعلیم وتربیت کے ساتھ اصلاحِ باطن اور راہِ سلوک کا دامن نہیں چھوڑا، اگر علمائے وقت سے قرآن وحدیث یا فقہ کی تعلیم حاصل کی تو مشائخِ وقت سے اصلاحِ باطن کا رشتہ بھی جوڑا اور حالات کے تقاضے کے تحت علمائے معقولات سے منطق وفلسفہ اور علمِ کلام میں فیض حاصل کیا۔

پھر برصغیر کے مسلمانوں میں ہر فرقے اور مکتبِ فکر کی جماعت رہی، سنی بھی اور شیعہ بھی، شیعوں کے مختلف فرقے تو سنیوں کی کئی جماعتیں، سنّی حضرات کے نمایاں مکاتبِ فکر کی بھی مختلف جماعتیں، مگر ہر ایک کا دعویٰ کہ وہ ''اہل سنت والجماعۃ'' ہے۔ حنفی المذہب مسلمانوں میں دو طبقے معروف ہیں۔ دیوبندی مسلک اور رضاخانی (بریلوی) مسلک، بریلوی حضرات تو سینہ تان کے اور خم ٹھونک کے اعلان کرتے ہیں کہ وہی اہل حق، اہل سنّت والجماعت ہیں، اصحابِ دیوبند بھی اہل سنت والجماعت کے علم بردار اور غیر مقلدین حضرات جو خود کو اہل حدیث کہلانا پسند کرتے ہیں (اور بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں عرب ممالک میں پٹرول کی

دریافت کے بعد ''سلفی'' لکھتے ہیں) اُن کا زعم ہے کہ وہی حق پر ہیں اور قرآن وسنّت کے پابند۔

ان تینوں مکاتبِ فکر کا سلسلۂ علم وسند حضرت شاہ ولی اللہؒ تک پہنچتا ہے، برصغیر کی یہ تین نمایاں جماعتیں ہیں جو بہر حال شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے خانوادے کے علوم وفیوض کی رہین منت ہیں۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کے زمانے تک علومِ دینیہ کے ساتھ سلوک وتصوف کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اب ایک جماعت نے تو تصوف کو لغو، باطل یا افیم تک قرار دے دیا، اور دوسری جماعت میں صوفیاء کے درجاتِ غوث، قطب، ابدال کے القاب کے ساتھ طریقت ہی کو دین کا جزو اعظم بنا دیا۔ مگر ایک راستہ اعتدال کا تھا، شریعت اور علومِ شریعت کو اہمیت دینا اور سلوک وتصوف کو صرف باطنی اصلاح کا ذریعہ بنانا، یہی وہ مسلک تھا جو حقیقۃً اہل سنّت والجماعت کا ہوسکتا تھا، اور یہی ہے وہ ''مسلکِ دیوبند'' جو اہلِ حق کے مسلک کی نمائندگی کرتا ہے، اس میں دیوبند کا الحاق صرف اس وجہ سے کہ علماء ومشائخ دیوبند اس پر قائم رہے اور اسے اپنا نصب العین بنایا۔

مگر علمائے دیوبند، بانیانِ دارالعلوم جو اہلِ سنت والجماعت کے مسلک پر قائم رہ کر دینی علوم کی اشاعت، اصلاحِ عقائد اور غیر اسلامی رسوم ورواج وبدعات کے خاتمے کی مہم میں مشغول رہے ان کے لئے بعض طبقوں کی طرف سے یہ الزام عائد کیا گیا یہ ''دیوبندی مسلک'' گویا اک ''نیا فرقہ'' ہے، چنانچہ اکابرِ دیوبند نے دارالعلوم دیوبند کے مسلک کی وضاحتیں کیں اور عام بدگمانیوں کو دور کرنے کے لئے تقریر وتحریر کا سہارا بھی لیا۔

مگر بلاشبہ علمائے دیوبند کے مسلک ومزاج کی ترجمانی کا جو کارنامہ حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ نے انجام دیا اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اپنے ساٹھ سالہ دورِ اہتمام میں دارالعلوم کی تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ دارالعلوم دیوبند کے مسلک کی تشریح اور ترجمانی فرمائی، اسلئے بجاطور پران کو ''ترجمانِ مسلکِ دیوبند'' کا لقب بھی حاصل ہے۔

ہندوستان کی آزادی سے قبل اور بعد میں بھی ملک و بیرونِ ملک دارالعلوم دیوبند اور اسکے مسلک کے بارے میں یا تو مسلمانوں اور اہلِ علم حلقوں میں بدگمانیاں تھیں یا تعارف نہیں تھا، بحمد اللہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ساٹھ سالہ دورِ اہتمام وانتظام میں یہ بدگمانیاں دور ہوئیں، غلط فہمیاں رفع ہوئیں اور حلقۂ تعارف وسیع ہوا، خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے ملکی و غیر ملکی اسفار میں جہاں جہاں خطاب فرماتے، علمائے دیوبند کے دینی رخ اور مسلکی مزاج کی پوری تشریح اس انداز میں فرماتے کہ اہلِ علم کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کو بھی یہ معلوم ہو جاتا اور یقین ہو جاتا کہ ان کا مسلک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان **''ما انا علیه و اصحابی''** کے مطابق ہے اور اس کا ثبوت دلائل کے ساتھ مل جاتا، اہل سنّت والجماعت کا جو شرعی مفہوم بنتا ہے اس کے علمبردار دیوبند اور اکابرِ دیوبند نظر آتے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا پوری دنیا کے تقریباً تمام برِاعظموں میں مختلف ممالک کے بڑے شہروں کا سفر ہوا، ہر جگہ عوامی خطاب بھی اور علمی مجالس بھی، اور اپنی خداداد خطابی صلاحیتوں کے ذریعہ مسلمانوں میں تبلیغی اور غیر مسلموں میں دعوتی خدمات انجام دیں، دارالعلوم دیوبند کا تعارف کرایا، جامعات ومدارس اور دینی وملّی تنظیموں سے رابطے پیدا کیے، اور اکابرِ دیوبند کی دینی خدمات سے عوام کو روشناس کرایا، جہاں ایک طرف ان کے واسطے سے دارالعلوم دیوبند کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی وہیں مسلکِ دیوبند و اکابرِ دیوبند کا بھرپور تعارف ہوا۔ جہالت یا دینی

امور کی جانب سے بےتوجّہی کے نتیجے میں برِصغیر ہند میں خاص طور پر اور عالمی سطح پر عام طور پر جو بدعات، غلط عقائد اور مشرکانہ رسوم ورواج مسلم حلقوں میں عام تھے ان میں کمی آئی، اور دینی رجحانات کا غلبہ ہوا۔ اہل سنّت والجماعت کے نمائندوں اور دیوبند وعلمائے دیوبند کا حلقہ عام ہوتا چلا گیا۔

اور ''مسلکِ علمائے دیوبند'' کے ترجَمان حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ترجَمانی صرف خطابات اور علمی مجلسوں تک ہی محدود نہیں رہی، باضابطہ اپنی تحریروں اور مضامین کے ذریعہ اس مسلک کی وضاحت فرمائی، اجلاسِ صد سالہ دارالعلوم دیوبند منعقدہ ۱۹۸۰ء کے موقع پر دارالعلوم نے ''تاریخِ دارالعلوم دیوبند'' دوجلدوں میں شائع کی جس کا مقدمہ ایک طویل مقالے کی صورت میں محفوظ ہے، جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر کردہ مسلکِ دیوبند کے تمام اصول و فروع اور جزئیات پر مشتمل ہے۔ اور علمائے دیوبند کے دینی رخ پر مشتمل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج'' کے نام سے متعارف ہے، اور جس کے مطالعہ سے یہ بات آشکارا ہوجاتی ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ وتابعینِ عظامؒ واسلافِ اسلام کے ذریعہ جو دینِ حنیف وصراطِ مستقیم کی وضاحت واشاعت ہوئی، اس پر قائم رہنے، عام کرنے اور اس کے حلقے میں لانے کیلئے علمائے دیوبند نے کوئی کوتاہی نہیں کی اور نہ اس میں لغو وباطل عقائد یا خرافات کو شامل کرنے کی اجازت دی۔

حکیم الاسلامؒ کے
دورِ اہتمام میں عربی زبان وادب

مقاصد دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے قیام اور اس کے پس منظر کی تاریخی تفصیلات سے قطع نظر ایک بات بہر حال مسلّم حقیقت ہے کہ یہ صرف ایک دینی درسگاہ اور عربی مدرسہ نہیں بلکہ برِصغیر ہند میں احیائے اسلام کا عنوان ہے اور دینی علوم وعقائد کی اشاعت اس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے، اور ان اہم مقاصد کی تکمیل کسی روایتی مدرسے یا ادارے سے نہیں ہوسکتی، اس لئے دارالعلوم دیوبند حقیقت میں ایک تحریک کا نام ہے جس کو تاریخی طور پر تسلیم بھی کیا جا چکا ہے، اس کی مزید وضاحت کیلئے ''تاریخ دارالعلوم دیوبند'' کی یہ سطور پیش ہیں:

> ''دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کیلئے عمل میں لایا گیا ان کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستور اساسی میں حسب ذیل بیان کی گئی ہے:
>
> ۱۔قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہونچانا، رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔
>
> ۲۔اعمال واخلاق اسلامیہ کی تربیت اور طلبہ کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔
>
> ۳۔اسلام کی تبلیغ واشاعت اور دین کا تحفظ ودفاع اور اشاعت اسلام

کی خدمت بذریعہ تقریر وتحریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم وتبلیغ کے ذریعہ خیرالقرون اور سلف صالحین جیسے اعمال واخلاق اور جذبات پیدا کرنا۔

۴۔حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم وفکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵۔علوم دینیہ کی اشاعت کیلئے مختلف مقامات پر مدارسِ عربیہ قائم کرنا اوران کا دارالعلوم سے الحاق۔

یہ وہ مقاصد ہیں جو اگر چہ اسلامی روایات وتاریخ کے دامن سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں مگر اس وقت ان کے احیاء وتجدید کی ضرورت اسلئے درپیش تھی کہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں حکومت کی تبدیلی اور محرومی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علم وعمل اور فکر ونظر میں جو اختلال اور رخنہ پیدا ہو گیا تھا اس کے انسداد کیلئے ناگزیر تھا کہ آئندہ کیلئے ایسے وسائل اختیار کیے جائیں جن کے ذریعہ سے اسلام،اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی حفاظت کی جا سکے ،دارالعلوم کا نصب العین انہی مقاصد کا احیاء اور ان کی تجدید ہے''۔

(تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۱۴۲)

گویا دارالعلوم دیوبند کے قیام کا بنیادی مقصد ہندوستان میں دین اور علوم دین کا احیاء وتحفظ تھا جس کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو گمراہی سے بچانا،مسلم معاشرے میں صحیح عقائد واعمال کی ترویج اور دین کی بقا مقصود تھی۔

مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی اور دینی علوم کی تدریس کا آغاز ہوا،ان علوم وفنون کی ترتیب اور تعلیمی منہج کی تعیین اکابر دیوبند یعنی مؤسسین دارالعلوم دیوبند نے قرآن وحدیث اور ان کے متعلقہ علوم کو بنیاد بنا کر کی۔دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم کے سلسلے میں مذکورہ بالا مقاصد کی روشنی میں تعبیرات اور وضاحتیں مختلف ہوسکتی ہیں، مگر تاریخی طور پر جو حقائق ہیں وہ یہ کہ ابتدا سے درجۂ فضیلت تک جو کتابیں داخل

درس رہی ہیں، ان میں قرآن، تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ کے بنیادی دینی موضوعات کے علاوہ دیگر فنون کی وہ کتابیں بھی شامل رہی ہیں جو ان علوم سے متعلق یا ان کیلئے معاون ومفید اور ضروری ہیں اور وہ کتابیں جو زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے اشاعتِ دین یا اسلام کے دفاع کیلئے مناسب خیال کی گئیں، جیسے عربی زبان وادب کی جملہ اقسام نحو وصرف، معانی، بیان، بدیع، عروض و بلاغت اور منطق وفلسفہ، علمِ کلام وعقائد، ہیئت وریاضی، تاریخ، فارسی، ادب، اردو زبان وغیرہ۔

ہندوستان میں رائج نصابِ تعلیم

یہاں یہ بات دھیان میں رہے کہ ہندوستان میں بارہویں صدی ہجری سے دینی مدارس کیلئے جو نصابِ تعلیم رائج ہوا وہ درسِ نظامی کے نام سے معروف تھا، جس میں اس زمانے کے مروّجہ علوم وفنون کو زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے، اور یہ کتابیں عام طور پر سب عربی زبان ہی میں تھیں، سرکاری اور علمی زبان فارسی تھی اسلئے عربی درجات کی تعلیم سے قبل چار یا پانچ سال تک فارسی زبان وادب پر مشتمل ''درجۂ فارسی'' کا نصاب ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے دہلی میں جو نصابِ تعلیم جاری کیا وہ بھی اس درسِ نظامی کا عکس تھا، مگر جب آپ حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں چودہ مہینے قیام فرمایا ، اساتذۂ حدیث سے علمِ حدیث کی تکمیل کر کے لوٹے تو اب ان کی توجّہ کتاب و سنت کی جانب مبذول ہوگئی۔ اب دہلی میں تفسیر وحدیث کو اہمیت حاصل ہوئی، ان کے تلامذہ محدثین نے کتاب وسنت اور خاص طور پر صحاح ستّہ کے درس وتدریس اور تشریح پر توجّہ مرکوز کردی اور اس کو نصاب کا اہم حصہ بنا دیا۔ رفتہ رفتہ مرکزِ علم دہلی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ اور خیرآباد بھی قرار پایا۔ اور جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں دہلی میں

قرآن وحدیث کی تعلیم کو اوّلیت حاصل ہوئی اور لکھنؤ کے فرنگی محل میں فقہ اور اصولِ فقہ کو مرکزیت ملی، خیرآباد معقولات (منطق وفلسفہ) کا مرکز بنا۔

اس طرح تیرہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں علوم وفنون اسلامیہ کے تین مراکز فکر قائم تھے، اور تینوں مرکز کا نصابِ تعلیم کافی حدتک مشترک تھا مگر دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تلامذہ و افرادِ خاندان کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور تعلیم وتدریس میں مشغول رہے، معقولات کی کتابیں ثانوی درجے میں تھیں، دوسری جانب لکھنؤ میں علماء فرنگی محل پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی کا قدیم رنگ غالب تھا، فقہ اور اصولِ فقہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اور خیرآباد کا علمی مرکز منطق وفلسفہ کی تعلیم کیلئے مستند کہا جاتا تھا اور دیگر علوم ثانوی حیثیت میں تھے۔

تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں ان تینوں مقامات کی علمی مرکزیت ختم ہوگئی تاہم ہندوستان کے عربی مدارس میں ان مراکز کے اثرات موجود تھے۔ اور جب بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد برائے نام اسلامی حکومت بھی ختم ہوگئی اور انگریزوں نے اسلامی علوم وتہذیب کو بالکلیہ مٹانے کا عزم لئے علماء دین اور مجاہدین کو قتل کر کے مغربی تہذیب عام کرنے کی راہیں ہموار کیں تو باقی ماندہ چند اولیاء اللہ اور علماء دین نے دیوبند میں عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔

دیوبند کا نصابِ تعلیم

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے نصابِ تعلیم میں ان تینوں مراکز علم کی خصوصیات کو یکجا کر دیا گیا۔ قرآن وحدیث کو اوّلیت دی گئی، فقہ، اصول کو بھی نمایاں جگہ حاصل ہوئی، منطق وفلسفہ کی کتابیں بھی شاملِ نصاب رہیں، اس کے ساتھ ساتھ عربی ادب کی کچھ کتابوں اور علوم کو بھی جگہ ملی جو اس سے پہلے کسی بھی مرکز میں لائق اعتناء نہیں رہے۔ عربی کے ابتدائی درجات میں نحو وصرف اور معانی کی بیشتر

کتابیں فارسی زبان میں رائج تھیں وہی دیوبند میں بھی موجود رہیں مگر عربی ادب کے حصہ نظم ونثر کی کتابیں بھی داخل درس کی گئیں، اورا کابر دیوبند نے عربی زبان وادب کو اس حد تک حاصل کرنا لازم قرار دیا جس سے مآخذ ومصادر علوم شریعت سے استفادہ بسہولت ممکن ہو، حدیث، تفسیر اور فقہ کی درسی کتابوں کے علاوہ ان کے شروحات یا ان علوم کی قدیم کتب کو سمجھنا اوراس کی تشریح کرنا بغیر عربی زبان وادب پر قدرت حاصل کیے ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ بات دیگر ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی شہرت تعلیمی اور تدریسی گوشے میں علم حدیث کی امتیازی تدریس کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔

دیوبند میں علوم حدیث کی تعلیم وتدریس اس کا ایک نمایاں وصف ہے، مگر فقہ واصولِ فقہ اور معقولات کی کتابوں پر زور بھی عرصۂ دراز تک جاری رہا ہے۔ اور ابتداء سے آج تک کے اس کے نصاب تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ارباب حل وعقد اور علماء دیوبند نے حسبِ ضرورت ان میں تبدیلیاں بھی کی ہیں، صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی دیگر متداول کتابوں میں کسی طرح کی کمی نہیں کی گئی، تفسیر، فقہ اوراس کے متعلقات میں تبدیلیاں بہت کم ہوئیں، البتہ علوم معقولات کی ضرورت کم ہوتی گئی تو نصاب سے اس کی بیشتر کتابوں کو ختم کردیا گیا، منطق اور فلسفہ کی ابتدائی چند کتابیں باقی رہ گئیں (اب مزید اس کی تخفیف کی ضرورت ہے)۔ اس کے ساتھ ساتھ ضروری عصری علوم (تاریخ، ریاضی وغیرہ) کو بھی شامل کیا جاتا رہا، مگر صرف اسی حد تک کہ بنیادی علوم پر توجّہ کم نہ ہونے پائے۔ یہ تفصیلات یہاں ضمناً ذکر کردی گئیں ورنہ عنوان کی مناسبت سے ہماری توجّہ دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کی اہمیت اور فروغ کے بیان پر ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب

دارالعلوم کے ابتدائی تقریباً سو سال میں دستور اساسی میں بیان کردہ مقاصد

کے تحت تعلیم پر زور صرف دینی علوم کے اساس یعنی تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام پر دیا گیا، اور چونکہ نصاب میں داخل یہ اساسی علوم عربی زبان میں تھے اسلئے ان کو سمجھنے اور اخذ کرنے کیلئے لامحالہ طور پر عربی پر اتنی قدرت لازمی تھی جس سے ان کتابوں اور مراجع امہات الکتب کو صحیح طور پر سمجھا جا سکے، اسلئے درسِ نظامی کے ابتدائی تین سالوں میں عربی صرف ونحو اور معانی بیان کی کئی کئی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو فارسی زبان میں یا عربی ہی میں تھیں، روایتی طریقِ تدریس میں صرف عربی کا مفہوم سمجھ لینے کی حدتک عربی صرف ونحو یا ہلکے پھلکے مواعظ وحکایات کی عربی کتابیں جاری رہی ہیں، تمام کتابوں کو رائج اردو زبان کے ذریعہ پڑھایا جاتا رہا ہے اور یہ اس بنیاد پر کہ یہ دینی ودعوتی علوم مادری زبان ہی میں آسانی سے پڑھے اور پڑھائے جا سکتے ہیں اور اس طرح یہ علوم حاصل کرکے دینی خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔

دارالعلوم دیو بند میں عربی زبان و ادب سے بے اعتنائی نہیں برتی گئی، قدیم وجدید عربی ادب پڑھایا جاتا رہا مگر اس میں خطابت، گفتگو اور انشاء کی مہارت پر زور نہیں دیا گیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اکابر دیو بند اور فضلائے دارالعلوم عربی زبان و ادب سے ناآشنا تھے، خود بانیانِ دارالعلوم میں سے حضرت مولانا ذوالفقار علی دیو بندیؒ (حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے والد) عربی کے بہترین ادیب تھے، اور اس حد تک قدرت تھی کہ عربی کی کئی ادبی کتابوں کی شرح خود عربی یا اردو میں تحریر کی ہے اور دوسری تصنیفات عربی سے متعلق رہیں، اسی طرح حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں بہت سے ایسے باکمال افراد تھے جو بطور محدث متعارف تھے مگر عربی زبان پر مکمل قدرت رکھتے تھے، پڑھنے، لکھنے، بولنے اور تقریر کی مہارت بھی ان میں موجود رہی یہ ان کی اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنتوں کے ساتھ مروّجہ نصابِ تعلیم کے تعاون ہی سے حاصل ہوا۔ چنانچہ اس سو سالہ دور میں تفسیر وحدیث اور فقہ وعقائد پر کتابوں کی عربی

شروحات یاان موضوعات پر مستقل تصانیف اس کی بیّن شاہد ہیں۔

اور جب علامہ رشید رضا مصری ہندوستان کے دورے پر آئے، دیوبند میں حاضری دی اور بخاری شریف کے درس میں شریک ہوئے تو محدث یگانہ امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث کا پورا درس فی البدیہہ عربی زبان میں دیا، جسے سننے کے بعد صاحب ''المنار'' نے دیوبند کے علمی مقام اوراہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا ''اگر میں دیوبند نہ آتا تو میرا سفر ہند ادھورا رہتا'' اس کے علاوہ حضرت علّامہ کشمیری علیہ الرحمۃ کی مختلف موضوعات پر عربی تصانیف ان کی عربی پر مکمل مہارت کا واضح ثبوت ہیں۔ان کے بعد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہے جن کے بارے میں تاریخ بتاتی ہے کہ وہ عربی میں گفتگو پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے، ان ہی حضرت شیخ الہند کے شاگرد محدثِ کبیر مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ کا معمول تھا کہ وہ بخاری کا درس عام طور پر اردو کے ساتھ عربی میں بھی دیتے رہے۔اور تقسیمِ ہند کے بعد دارالعلوم دیوبند کی ایک ممتاز شخصیت حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ کی تھی جو شیخ الادب کے لقب سے پہچانے جاتے تھے، جملہ علوم دینیہ پر کمال حاصل ہونے کے ساتھ وہ قدیم وجدید عربی پر بھی اتنی ہی مہارت رکھتے تھے،اور حضرت علّامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بے شمار شاگرد ایسے تھے جو عرب علماء میں بھی عربی پر قادر ہونے کے لحاظ سے مستند سمجھے جاتے تھے،مولانا محمد یوسف بنوریؒ،مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ،مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ وغیرہ اس کے تابندہ نمونے ہیں۔

البتہ اس عہد میں دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب پر نصابی یا تدریسی طور پر اتنا زور نہیں دیا جاتا تھا اور نہ اس کیلئے کوئی الگ شعبہ قائم کیا گیا تھا جس کی وجہ سے دیوبند کا نام ادبی بنیادوں پر نمایاں ہوتا۔جبکہ اس کے برخلاف ہندوستان کی غلامی

کے دور میں دوسرے درجے میں زیادہ توجّہ معقولات پر صرف ہوتی رہی جن علوم کی معقولیت اور مقبولیت روز بروز کم ہوتی جارہی تھی، مناظرے، علمی مباحثے، مناقشے اور لاینحل پیچیدہ مباحث کا دور ختم ہوا جارہا تھا، اور اکابر دیوبند نصاب میں جزوی تبدیلیاں کرکے ان فلسفہ اور منطق کی کتابوں کو خارج بھی کرتے رہے۔

دارالعلوم دیوبند کی شہرت عرب ممالک تک پہونچی، اس کی خدمات کا ذکر ہوا تو عرب تعلیم گاہوں کی توجّہ بھی دیوبند کی جانب ہوئی چنانچہ بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی میں جامعہ ازہر قاہرہ سے وفود کی آمد شروع ہوئی اور باضابطہ دو عرب استاذ دارالعلوم میں تدریس کے لئے مبعوث کیے گئے، شیخ عبدالمنعم النمر جو بعد میں جامعہ ازہر کے شیخ الجامعہ بھی ہوئے اور دوسرے شیخ عبدالعال العقباوی۔ اور جب عرب ممالک آزاد ہوتے گئے، ان میں پیٹرول دریافت ہوا، پوری دنیا مشرق وسطیٰ کے جانب متوجہ ہوئی تو ہندوستان کی تعلیم گاہوں سے روابط کا سلسلہ شروع ہوگیا، اربابِ شوریٰ دارالعلوم اور اربابِ حلّ وعقد دارالعلوم دیوبند کو بھی محسوس ہونے لگا کہ عربی زبان پر ہمہ جہت قدرت حاصل کرنے کیلئے دارالعلوم کو بھی ایسے افراد کی ضرورت ہے اور ایسی کتابوں اور شعبوں کی جن کی وجہ سے دارالعلوم کے طلبہ بھی نمایاں ہوں جو دیوبند کی اہمیت، افادیت اور دینی خدمات کو عرب دنیا میں متعارف کراسکیں، اور گوکہ ان عرب اساتذہ کی وجہ سے طلبہ میں بھی داعیہ پیدا ہوا اور دارالعلوم دیوبند کی فضا میں عربی زبان وادب کی خوشبو پھیلنے لگی تھی مگر مکمل انقلاب اس وقت آیا جب عربی تمرین اور خطابت وانشاء کے فروغ کیلئے ادیبِ زماں حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی علیہ الرحمۃ دارالعلوم کے اساتذہ میں شامل ہوئے۔

مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کا عہد

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قدس سرہٗ کا زمانۂ اہتمام دارالعلوم

دیوبند اپنی خدمات کی وجہ سے جہاں برصغیر ہند کے علاوہ پوری دنیا میں ایک روشن مثال ہے جو اپنی تعمیرات، علمی ترقیات، رفعتوں اور وسعتوں کی وجہ سے تاریخ دارالعلوم کا سب سے نمایاں باب ہے وہیں اس لحاظ سے بھی اسے تفوق اور امتیاز حاصل ہے کہ ان کے عہد میں، ان کی کوششوں سے دارالعلوم دیوبند میں عربی زبان وادب کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ کی تائید اور معزز رکنِ شوریٰ دارالعلوم حضرت مولانا منّت اللہ رحمانیؒ امیر شریعت بہار واڑیسہ کے مشورہ سے عربی زبان وادب کی ترویج کیلئے حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ کا ۱۹۶۳ء میں بحیثیت استاذ عربی تقرر کیا گیا۔

مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد حیدرآباد کا سفر کیا اور وہاں ایک جیّد عالم علّامہ المامون الدمشقی سے عربی زبان کی تعلیم پائی، بولنے، لکھنے اور ترجمہ کرنے کی پوری تربیت ان کے ساتھ ساتھ رہ کر پائی۔ پھر دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر ۱۹۵۲ء میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، پھر مختلف اداروں وشخصیات کے ساتھ عربی مترجم کی حیثیت سے وابستگی کے بعد ۱۹۵۹ء میں دیوبند ہی میں ایک ادارہ ''دارالفکر'' قائم کیا اور غیر رسمی طور پر عربی زبان کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا، مگر ابھی اتنا بڑا میدان اور حلقہ نہیں تھا اس کے باوجود ارباب حلّ وعقد دارالعلوم کی جوہر شناس نظروں نے تاڑ لیا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم دیوبند میں مدرسِ عربی کی حیثیت سے مامور کیا، ان کا تقرر اسی مقصد کے پیشِ نظر تھا کہ دارالعلوم میں عربی زبان وادب کی ضرورت کی تکمیل ہو اور طلبہ میں عربی کیلئے شوق اور دلچسپی قائم ہو، ان میں پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ عربی میں گفتگو، خطابت اور انشا پردازی کی صلاحیت پیدا ہو، اس کیلئے ان کو مکمل اختیار دیا گیا کہ وہ موزوں اور مناسب

کتابوں کو شامل کریں اور طریق تدریس کو انکی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ خود استاذ محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے بار ہا راقم الحروف سے اور درسگاہ میں فرمایا تھا کہ حضرت مہتمم صاحب نے مجھے مکمل اختیار دے رکھا ہے۔

اب شروع ہوا وہ انقلابی دور جس کو بلاشبہ دیوبند میں عربی زبان وادب کے عروج کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ طلبہ کو عربی زبان سے مانوس کرنے اور انھیں تربیت دینے کیلئے کوئی متعین کتاب نہیں تھی، البتہ انتظامیہ کی جانب سے درجۂ عربی کے متوسطات میں ''عربی تمرین'' کیلئے صفِ ابتدائی اور صفِ ثانوی کے عنوان سے ایک ایک گھنٹہ لازمی قرار دیا گیا۔ اور علیا درجات میں صفِ نہائی (آخری درجہ) کو اختیاری قرار دیا گیا کہ جو طلبہ چاہیں اس میں حصہ لیں اور یہ تمام گھنٹے (پیریڈ) صرف مولانا وحید الزماں صاحبؒ سے ہی متعلق رہے، اس کے علاوہ عربی ادب کی مشہور کتاب ''مقاماتِ حریری'' کی تدریس بھی ان سے متعلق کردی گئی، جہاں وہ عام روش سے ہٹ کر زیادہ ادبی قواعد کے بیان کی بجائے عربی ذوق پیدا کرنے پر زور دیتے تھے، ۱۹۶۸ء میں راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا، مختصر المعانی، شرح وقایہ کی جماعت تھی، ایک گھنٹہ صفِ ابتدائی کیلئے مخصوص تھا اور دوسرے گھنٹے میں بھی مقاماتِ حریری حضرت مولانا سے پڑھنے کا موقع ملتا، اس انوکھے طرزِ تدریس کا اثر تھا کہ مجھے مقامات کے بیشتر اشعار اور عبارتیں زبانی یاد ہوگئیں اور سالہا سال تک حافظے میں موجود رہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں طلبہ کے درمیان عربی میں گفتگو، عربی میں تقریر یا عربی کا ماحول ایک غیر مانوس چیز کے درجہ میں رہا۔ اسلئے ابتدا میں اس کی پذیرائی بھی وسیع پیمانے پر نہیں ہوسکی مگر مولانا وحید الزماںؒ نے درس وتدریس کے علاوہ ان عربی تمرین کی جماعتوں سے وابستہ طلبہ کی تربیت کچھ اس انداز میں کی کہ رہن سہن،

کھانے پینے، طلبہ کی اجتماعی معاشرت اور درس ومطالعہ کی خوش سلیقگی کا اثر دوسرے طلبہ پر بھی پڑنے لگا اور سب ہی اس جانب متوجہ ہو گئے، دراصل اس کا سہرا حضرت مولانا کیرانوی مرحوم کی جد وجہد اور ان کے ذریعہ قائم کردہ طلبہ کی عربی انجمن ''النادی الادبی'' کے سر بندھتا ہے۔ اور عربی زبان وادب کے فروغ کا جدید انقلابی دور شروع ہوتا ہے۔

النادی الادبی کا کردار

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے دارالعلوم دیوبند سے وابستگی کے بعد ہی طلبہ میں عربی زبان وادب کی روح پھونکنے کیلئے درس وتدریس کے اوقات کو اس کیلئے مشغول کیا۔ ساتھ میں طلبہ کو محادثہ اور خطابت، انشاء پر قدرت کیلئے غیر درسی اوقات میں بھی عربی ماحول سے آشنا رکھا، جس کیلئے انھوں نے طلبہ کی ایک تقریری وتحریری انجمن ''النادی الادبی'' قائم کی۔ چند سال میں ہی اس کے مفید اثرات ظاہر ہونے لگے اور ارباب حلّ وعقد دارالعلوم دیوبند کو بھی اس کی افادیت کا اعتراف ہوا اور گو کہ طلبہ کی اجتماعی انجمن ''جمعیۃ الطلبہ'' انتظامیہ کی نظروں میں غیر درسی اور غیر مفید مشغولیات کا ذریعہ باور ہوتی تھی اسلئے اس کی حوصلہ شکنی ہوتی رہی، مگر جب حضرت مولانا کیرانویؒ نے مفید، مؤثر اور منظم عربی انجمن کو پروان چڑھایا تو حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف اس کی اجازت دی بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی اور ہر طرح کی انتظامی سہولت بہم پہونچائی، یہ بات خاص طور سے اسلئے تحریر کر رہا ہوں کہ حضرت الاستاذ ہمیشہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس جذبے کا احسان مندانہ انداز میں ذکر فرماتے رہے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اجلاسِ صد سالہ دارالعلوم دیوبند کے بعد انتظامیہ کے خلاف جو شورش پیدا کی گئی اس کی قیادت حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے ہاتھوں میں دیدی گئی،

اسلئے دارالعلوم یا حضرت کیرانوی کے تذکرہ نویس عام طور پر مولانا کیرانوی کو اہتمام اور انتظامیہ کے مخالف کے طور پر پیش کرتے ہیں یا حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کا معاند بتانے کی مذموم کوشش کرتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ جب ''النادی الادبی'' قائم ہوئی اور اس کی تقریری وتحریری سرگرمیاں سامنے آنے لگیں تو اربابِ اہتمام نے اس کو نہ صرف سراہا بلکہ ہر ممکن تعاون دیا۔ اور حضرت مولانا وحید الزماں کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا۔ اجلاسِ صدسالہ کے بعد حضرت مولانا کو بعض انتظامی امور سے اختلاف رہا جس کا تعلق صرف طلبہ کے حقوق کی حد تک تھا مگر طویل منصوبہ بندی کے ساتھ سازش کرنے والوں نے اس میں ایسے ایسے رنگ بھرے کہ الامان والحفیظ۔ (یاد ماضی عذاب ہے یارب!)

بہرحال النادی الادبی کا سفر جاری رہا، سرگرمیاں بڑھتی رہیں، طلبہ کی دلچسپی دوچند ہوتی گئی اور اس سے فیضیاب ہوکر چمکنے والے عربی زبان وادب کے آفتاب و ماہتاب طلوع ہوتے گئے، ملک کے گوشوں گوشوں کو منور کیا، بیرون ممالک بھی ان کی ضیا پاشیاں جاری ہوئیں۔ اور صحیح معنوں میں حضرت مولانا وحید الزماںؒ کی تدریس اور النادی کی نگرانی وسرپرستی کے ذریعہ جو خدمات انجام دی گئیں اس کو دس سالہ عہدِ عروج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۸ء۔ دراصل حضرت مولانا کی دارالعلوم دیوبند میں تقرری اور النادی کے قیام کے بعد کا پانچ سالہ ابتدائی دور عربی ماحول تیار کرنے میں صرف ہوا اور اس کا ثمرہ ظاہر ہونے میں کچھ وقت لگا، پھر دس سال تک حضرت کیرانویؒ نے اپنی شب وروز کی محنت سے انقلابی کیفیت پیدا کردی، صفِ ابتدائی، ثانوی، نہائی یا تکمیل ادب کے تقریباً تمام اسباق خود سے متعلق رکھے اور پابندی کے ساتھ درس دیا، پھر اپنے بعض ہونہار فضلاء کا تعاون لیا۔ اس طرح ۱۹۷۸ء تک مکمل اوقاتِ درس عربی تدریس، تمرین، خطابت

و انشاء پردازی میں صرف کیے۔ ۱۹۷۸ء کے بعد جب دارالعلوم دیوبند میں اجلاس صد سالہ کیلئے انتظامی تیاریاں شروع ہوئیں تو ان کا بیشتر وقت تعمیراتی امور میں صرف ہونے لگا جو ان سے متعلق تھے اسلئے وہ دس سالہ دورِ تدریس ہی عربی زبان و ادب کے ایسے عروج کا زمانہ ہے جب سیکڑوں کی تعداد میں فضلائے دارالعلوم اس طرح تیار ہوئے کہ بیک وقت وہ تفسیر و حدیث اور فقہ کے علوم پر قدرت کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے ماہرین بھی تھے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے ابتدائی دور میں عربی زبان وادب کے وہ نمایاں ستارے جوان کی رہنمائی یا مشورے سے باکمال عربی ادیب بنے ان میں مولانا فصیح الدین دہلوی، ڈاکٹر بدرالدین الحافظ، ڈاکٹر زبیر احمد فاروقی، مولانا عمیدالزماں کیرانوی وغیرہ کے نام تاریخ ادب عربی ہند میں نمایاں رہیں گے اور النادی الادبی کے عروج کے دس سالہ دور کی یادگار فضلائے دیوبند کی ایک لمبی قطار ہے اور راقم الحروف بحمد اللہ اس دس سالہ زریں عہد کا معاون اور مشاہد رہا، اسلئے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک کچھ افراد کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے عربی زبان وادب سے وابستہ رہ کر نمایاں خدمات انجام دیں یا اب تک اس میں مشغول ہیں، اور برصغیر ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ عرب ممالک میں بھی ان کی صلاحیتوں کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔

۱-مولانا ابوبکر غازی پوری ۲-مفتی ابوالقاسم بنارسی
۳-مولانا عبدالوحید حیدرآبادی ۴-مولانا عبدالخالق مدراسی
۵-مولانا مسعوداحمد ہاشمی ۶-مولانا بدرالحسن قاسمی
۷-مولانا نورعالم خلیل الامینی ۸-مولانا عبدالوحید فیاضی
۹-مولانا الطاف الرحمٰن اعظمی ۱۰-مولانا مکرم الحسینی مونگیری

۱۱-مولانا ابوالعاص الوحیدی ۱۲-مولانا عبدالستار سلام
۱۳-مولانا عبدالخالق سنبھلی ۱۴-مولانا ندیم الواجدی
۱۵-مولانا عتیق احمد بستوی ۱۶-مولانا عبدالباری ازہری
۱۷-مولانا مختار سعید مدنی ۱۸-مولانا عبدالقدیر مدنی
۱۹-مولانا خالد بلیاوی ۲۰-مولانا محمد جیلانی
۲۱-مولانا ظہیر انوار بستوی ۲۲-مولانا نورالحق رحمانی
۲۳-مولانا رفیق احمد بستوی ۲۴-مولانا محمد عباس فتح پوری
۲۵-مولانا لئیق احمد میرٹھی ۲۶-مولانا ابوذر جونپوری
۲۷-مولانا افتخار حسین مدنی ۲۸-مولانا محمد فرقان بجنوری
۲۹-مولانا فخرالدین اعظمی ۳۰-مولانا مزمل الحق میرٹھی
۳۱-مولانا نثار احمد سہرساوی ۳۲-مولانا بدرالزماں کیرانوی
۳۳-مولانا عبدالقدوس نیرانوی ۳۴-مولانا شوکت علی بستوی

اور

راقم الحروف محمد اسلام قاسمی بھی عربی زبان وادب کے اسی قافلے کے قدم بہ قدم رواں دواں ہے۔

النادی الادبی کے اس دس سالہ عہدِ عروج کے یہ افراد عربی زبان وادب کے کسی نہ کسی گوشے سے وابستہ رہے اور ہیں، اور اپنے استاذ کے طرز پر تمرین وتربیت کے سلسلے کو آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں، خواہ وہ کسی حیثیت سے متعارف ہوں اور ملک وبیرون ملک کسی مقام پر ہوں محدث، فقیہ، مہتمم، مفتی، مترجم، مصنف، یا کسی تنظیم اور ادارے کے سربراہ ہی کیوں نہ ہوں، یا کسی وزارت کے اہم عہدے پر فائز یا تجارت سے وابستہ، ان کی علمی، ادبی اور دینی سرگرمیاں جاری

ہیں، مولانا فصیح الدین دہلوی اور مولانا عمید الزماں کیرانوی کی رحلت ہو چکی ہے اور باقی اللہ کے فضل وکرم سے حیات ہیں اور اپنی علمی وادبی زندگی کے آثار ثبت کر رہے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب عربی زبان وادب کی ہر جماعت کی تدریس کی ذمے داری خود حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے سپرد رہی اور النادی الادبی کے ہفت روزہ اجتماعات، سالانہ اجلاس اور عربی قلمی رسالوں کی نگرانی کو خود انھوں نے پوری مستعدی کے ساتھ سنبھالے رکھا۔

اجلاس صد سالہ کے دو سال قبل اور چند سال بعد تک حضرت مولانا کیرانویؒ کی تعمیراتی اور انتظامی اشتغال کے باعث اس تحریک میں اگر کمی آئی تو اس مردم ساز شخصیت کے باکمال تلامذہ نے اس سلسلے کو باقی رکھا، ترقی دی اور برابر اس میں مشغول ہیں، اسلئے بحمد اللہ اب دیوبند سے نکل کر ملک و بیرون ملک یہ باصلاحیت افراد عربی زبان وادب کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں، خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے ذریعہ ہو یا صحافت، تدریس، تصنیف وتالیف یا ترجمہ وتحقیق کی راہ سے، عربی زبان وادب کے یہ تابندہ ستارے کسی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی بھی ملیں گے، ریسرچ اسکالر بھی، مصنف ومترجم تو بے شمار، عربی مدارس میں درجۂ تخصص عربی کے سربراہ، اور ان سب کے علمی کارنامے تلامذہ کے علاوہ ان کی تصنیفات کی صورت میں، یہاں ہر ایک کے قلمی شاہکاروں کے بالاستیعاب ذکر کرنے کا موقع نہیں (ضرورت تو ہے کہ کوئی فرد یا ادارہ تحقیق وجستجو کے بعد ان کے خدمات اور کارناموں کو مرتب کرے)

اجلاس صد سالہ منعقدہ ۱۹۸۰ء کے بعد بھی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی نگرانی اور صحبت میں بہت سے ''رجال'' تیار ہوئے جو ملک کے گوشے

گوشے اور بیرون ملک میں مشغول خدمت ہیں۔

عربی زبان وادب کے مزید گوشے

دارالعلوم دیوبند نے نہ صرف عربی زبان وادب کے اس شعبے کو ترقی دی، بلکہ صحافت اور تصنیفات کی راہ سے بھی عربی زبان کے ذخیرے میں اضافہ کیا ہے۔ سب سے پہلے سہ ماہی عربی رسالہ ''دعوۃ الحق'' جاری ہوا جس کی مکمل نگرانی مولانا وحیدالزماں صاحبؒ سے متعلق رہی، باوجودیکہ دیوبند اور دہلی میں اس وقت عربی کمپوزنگ اور طباعت کی سہولت فراہم نہیں تھی اور رسالے کو حیدرآباد یا اعظم گڑھ کے مطابع میں طبع کرایا جاتا تھا۔ اس دوران جمعیۃ علماء ہند نے اپنا ترجمان پندرہ روزہ ''الکفاح'' جاری کیا۔ مولانا کیرانویؒ مدیر اعلیٰ رہے، مدیران میں نور عالم خلیل الامینی، عبدالوحید فیض آبادی اور پھر الطاف الرحمٰن اعظمی ہوئے، معاونین میں محمد جیلانی فیض آبادی از ابتدا تا انتہا رہے، اور ایک معتد بہ مدت تک راقم الحروف بھی اس سے وابستہ رہا۔ ''دعوۃ الحق'' کسی وجہ سے بند ہوا تو اہتمام دارالعلوم نے پندرہ روزہ عربی اخبار ''الداعی'' کا اجراء ۱۹۷۶ء میں کیا، مولانا وحیدالزماں کی نگرانی میں ادارت کی ذمے داری مولانا بدرالحسن قاسمی پر عائد ہوئی اور احقر معاون ومرتب کے طور پر ۱۹۸۲ء تک وابستہ رہا (اب الداعی ماہنامہ رسالے کی صورت میں مولانا نور عالم خلیل امینی کے زیر ادارت جاری ہے)

پندرہ روزہ الداعی کو ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک کے علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور ادبی حلقوں نے سراہا۔

مارچ ۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے احقر علیٰحدہ ہوا تو معاشی شکست وریخت کے مراحل سے بھی گذرا مگر عربی زبان وادب سے جو تعلق قائم ہوا تھا وہ برقرار رہا، تدریس کے ساتھ ''دار الثّقافه'' ادارے کے تحت ماہنامہ ''الثّقـافة'' عربی کا

اجرا کیا جو دو سال تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے مضامین اور تبصرے عرب رسالوں اور اخبارات نے بھی شائع کیے جو اس کی مقبولیت اور اعتماد کی دلیل ہے۔

عربی زبان و ادب کیلئے دارالعلوم دیوبند اور اس کے فرزندوں کا ایک بڑا کارنامہ ان لغات کی ترتیب اور اشاعت ہے جس کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی۔ عربی سے عربی یا انگلش میں قوامیس اور لغات تو بے حد تھے، مگر برصغیر کی رائج زبان اردو میں کوئی لغت موجود نہیں تھی، سب سے پہلے حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ (فاضل دیوبند) استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے عربی سے اردو میں ''مصباح اللغات'' کی تصنیف کی جو اس حد تک مقبول عام ہے کہ اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ پھر مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی کی بیان اللسان، اور ادیب زماں حضرت مولانا وحیدالزماں کیرانوی کی لغات پر مشتمل سیریز ہے ،القاموس الجدید عربی اردو، القاموس الجدید اردو سے عربی، القاموس الاصطلاحی، اور اخیر میں دو ضخیم ترین جلدوں پر مشتمل القاموس الوحید۔ اس کے علاوہ مولانا کی نصابی تصنیف القراءۃ الواضحۃ ۳ حصوں میں گذشتہ ۳۵ سالوں سے عربی مدارس کی زینت ہیں، فضلائے دارالعلوم کی مزید تصنیفات جو عربی سیکھنے، پڑھنے، بولنے، ترجمہ کرنے اور خطوط نویسی کی مشق کیلئے لکھی گئیں ہیں اور مقبول خاص و عام ہیں یہ سب عربی زبان و ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، خدا اس کو قائم و دائم رکھے۔ آمین

دارالعلوم دیوبند، علم حدیث

اور

حکیم الاسلامؒ

دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اور حدیث کو فوقیت

برصغیر ہند میں پہلی صدی ہجری ہی میں مسلمانوں کے قدم پڑ چکے تھے، مسلم فاتحین کے ذریعہ پورے خطہ میں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی ۔ رفتہ رفتہ یہاں مختلف مسلم حکومتیں قائم ہوئیں جن کے ذریعہ اسلامی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون کا رواج بھی ہوا۔ دسویں صدی ہجری میں باضابطہ مغلیہ دور حکومت کا آغاز ہوا جو طویل عرصے تک جاری رہا ، اور ۱۸۵۷ء میں اسکا خاتمہ ہوا ، اسی عہد حکومت میں یہاں اسلامی علوم وثقافت خاص طور پر قرآن وحدیث کی اشاعت نمایاں طور پر ہوئی ، یہ دوسری بات ہے کہ اسلامی علوم وفنون کے ضمن میں فقہ حنفی ، معقولات کے علوم اور دیگر یونانی وایرانی علوم کا دبدبہ زیادہ رہا۔علم حدیث کے درس وتدریس کا سلسلہ بھی رہا مگر محدود پیمانے پر، یہاں تک کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے معاصر معروف محدث حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے زمانے میں علم حدیث کا کچھ رجحان بڑھا، امام العصر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ابتدائی ایام میں

یہی صورتحال برقرار رہی اور جب انھوں نے حجاز کا سفر کیا اور وہاں سے مشہور محدثین سے علوم حدیث کا اکتساب کیا تو ہندوستان واپسی کے بعد اب نصاب تعلیم میں واضح تبدیلی ہوگئی، قرآن وحدیث کی تعلیم، اشاعت، تشریح اور تصنیف پر بیشتر توجہ مبذول ہوگئی، حدیث کی ایک نمایاں کتاب مشکوٰۃ المصابیح نصاب میں رائج تھی اور چند ابواب بخاری کے، اسکی بجائے اب حدیث کی صحاح ستہ اور دیگر کتب کی تعلیم عام ہوگئی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کا خانوادہ اور حلقہ کے تلامذہ ہی دراصل بلاد ہند میں اسلام کے بنیادی علوم قرآن وسنت کی اشاعت اور تعلیم کے سربراہ ہیں۔

پہلی صدی ہجری جس میں کبار صحابہؓ وتابعینؒ وحاملین علوم نبویہ موجود ہیں تدوین حدیث کا آغاز ہو چکا ہے۔ دوسری صدی ہجری میں تدوین و اشاعتِ حدیث مرتّب انداز میں شروع ہوگئی اور تیسری صدی ہجری علم حدیث کی تدوین، تالیف اور اشاعت کی معراج ہے۔ بلاد عرب حجاز، بغداد، شام اور مصر سے ہوتا ہوا اب محدثین کی ایک مستند اور بڑی جماعت بلاد خراسان (ماوراء النہر) میں موجود ہے اور علم نبوی کے بڑے مراکز بھی قائم ہوگئے ہیں، علوم حدیث پر مشتمل متعدد نوع کی وہ کتابیں جمع ہو چکی ہیں جن کی صحت پر امت کا اجماع ہے۔ اب بلاد عجم میں علم حدیث کی تدریس واشاعت زوروں پر ہے، اسلامی خلافت کی سرپرستی بھی ان میں سے بیشتر مراکز کو حاصل ہے۔ اور حکومت بغداد کے زوال کے دنوں میں بھی مشرقی ممالک خاص طور پر بلاد خراسان، نیشاپور، بخارا، سمرقند وغیرہ میں علوم نبویہ کے حاملین وطالبین اسکی اشاعت میں مشغول ہیں۔ تاتاریوں کے حملے کے بعد جب مسلم حکومتوں کی مرکزیت ختم ہوئی تو اسلامی علوم کی اشاعت میں زوال آیا ہے، مگر ان علوم وفنون کی حفاظت واشاعت ختم نہیں ہوئی ہے، علاقے بدل گئے ہیں مگر علوم نبویہ کی حفاظت جاری ہے، جامعہ ازہر کے معروف محدث ومؤرخ استاذ

محمد محمد ابوزھو اپنی کتاب ''الحدیث و المحدثون'' میں لکھتے ہیں:

''اگر مغربی دیار و بلاد کو مستثنیٰ کر دیا جائے جن کے احسانات حدیث نبوی پر ہر زمانے میں رہے ہیں تو ہم اپنے آپ کو دو عظیم مما لک کے درمیان پاتے ہیں، جو یکے بعد دیگرے حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اور وہ مما لک برصغیر پاک و ہند اور مصر ہیں۔۔۔۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سقوط بغداد سے لیکر ابتدائی تین صدیوں تک مصر کا علاقہ علماء سے بھرپور تھا اور اس ضمن میں تمام بلاد اسلامیہ سے سبقت لے گیا تھا۔ مگر دسویں صدی ہجری کے نصف تک پہونچ کر مصر میں حدیث کا آفتاب غروب ہونے لگا اور حدیث نبوی اور اسکے علوم وہاں سے برصغیر ہند و پاک کی طرف کوچ کرنے لگے۔ اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے ارض ہند و پاک کو خدمت حدیث کا شرف بخشا اور تاہنوز وہ اس سعادت سے بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔''

(تاریخ حدیث ومحدثین (اردو) ص ۵۷۷)

دسویں صدی ہجری کے بعد کا یہی وہ زرّیں دور ہے جب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے فیضیافتہ افراد نے حدیث کی خدمت پر توجہ کی ہے اور اسکو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کی نئی جہتیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے شاگردوں نے دی ہیں جسکا اعتراف مؤرخین اسلام ہمیشہ کرتے آئے ہیں، ان خدمات جلیلہ کی عکاسی مشہور شامی محدّث علامہ محمد زاہد الکوثری نے اپنے مقالات میں اس انداز میں کی ہے:

''برصغیر ہند کے رہنے والوں نے حدیث نبوی کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، دسویں صدی ہجری سے قبل یہ لوگ علوم نظریہ اور فقہی احکام میں منہمک رہتے تھے اس وقت سے یہ لوگ حدیث نبوی، اسکے علوم کی درس وتدریس اور نقد اسانید کو بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ایسے آڑے وقت میں جب کہ لوگ خدمت حدیث کیلئے کمربستہ نہیں تھے اور ہمتیں پست ہوگئی تھیں، اہالیان ارض ہند نے حدیث نبوی اور اس کے علوم کی جو خدمات جلیلہ انجام دی تھیں انھیں دیکھ

کر حیرت ہوتی ہے، برصغیر کے علماء ایسے تھے جنھوں نے صحاح ستہ کی نہایت مفید شرحیں لکھیں اور ان پر قیمتی حواشی تحریر فرمائے۔احادیثِ احکام سے متعلق علماء نے ضخیم کتب تصنیف کیں، نقد رجال، علل حدیث کے ذکر و بیان اور شرح الآثار کے ضمن میں ان کے احسانات نا قابل فراموش ہیں۔ اس طرح مختلف علوم الحدیث اور ان کے متعلقات کے بارے میں بھی ان کی تصانیف کچھ کم قابل قدر نہیں۔''

(مقالات الکوثری ص ۱۷)

دسویں صدی ہجری سے علم حدیث کی خدمت جاری رہی، بارہویں صدی ہجری تک اس میں کوئی کمی نہیں آسکی، دہلی مغلیہ حکومت کا دارالسلطنت بنا رہا، اور آخر میں حکومت کے عدم استحکام کے باوجود حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افرادِ خاندان علماء درس و تدریس میں مشغول رہے، اسی دوران اسلامی علوم کے دو مرکز اور مستحکم ہوئے، فرنگی محل لکھنؤ اور خیرآباد، فرق یہ تھا کہ دہلی میں قرآن و حدیث کی اشاعت ہی اہم رہی اور لکھنؤ میں فقہ کا غلبہ رہا، البتہ خیرآباد معقولات کا مرکز مانا جاتا تھا، مگر تیرھویں صدی ہجری کے نصف اخیر میں ان تینوں مقامات کی علمی مرکزیت ختم ہوگئی، البتہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جو عربی، اسلامی مدارس قائم تھے ان مراکز کے اثرات باقی تھے۔ بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی استعمار کا سب سے بڑا نشانہ یہی اسلامی مدارس بنے۔اب اسلامی علوم و تہذیب کی بقاء اور مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کیلئے بظاہر جو صورت اس وقت کے اولیاء و اتقیاء و باقی ماندہ علماء کے نزدیک تھی وہ یہی کہ دینی مدارس کا قیام ہو جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں برابر گونجتی رہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور علم حدیث

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کی سربراہی میں چند منتخب

روزگار علماء دین نے دیوبند میں عربی مدرسہ کی نبیاد رکھی، اور اسکے نصاب تعلیم میں ان تینوں مراکز علم کے منتخب علوم وفنون کو شامل کیا جو ہندوستان کے حالات، مزاج اور ضرورت کے مطابق مفید اور لازم تھے۔ مگر اس دینی درسگاہ کے قیام کے مقاصد میں یہ بات واضح تھی:

> ''قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد وکلام اور ان علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنون آلیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل معلومات بہم پہونچانا۔ رشد وہدایت اور تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی خدمت انجام دینا۔''

(تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول)

اسلئے درس وتدریس میں بنیادی طور پر اسلام کے بنیادی علوم قرآن وسنت کو ہی اہمیت دینا تھا۔ یہ بات یاد رہے کہ حضرت نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمھما اللہ دونوں اسی مرکز شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے آخری محدث شاہ عبد الغنی مجددی رحمہ اللہ سے علم حدیث کے فیض یافتہ تھے، اسلئے ترجیحاً علم حدیث اور اسکے متعلقات پر زیادہ زور دیا گیا۔ اور سو سال سے زائد عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اس مرکز علم ''دارالعلوم دیوبند'' کی شہرت، انفرادیت اور کمال، علم حدیث کی تدریس اور اسکی تشریح سے عبارت ہے۔ برصغیر کے علاوہ پوری دنیا میں علم حدیث کے سب سے بڑے مرکز حدیث کی حیثیت سے متعارف اور معترف ہے، چنانچہ اس ادارے کے سب سے پہلے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ہیں جنھوں نے علم کی سند حضرت شاہ عبد الغنی مجددی دہلویؒ سے حاصل کی، ان کے وہ تلامذہ جنھوں نے علم حدیث کی تعلیم مکمل کی ان کی تعداد ۷۷ ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی خدمتِ حدیث ازراہ تدریس جو معروف ہوئی وہ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کے ذریعہ سے ہے۔ جن کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے جنھوں نے

حدیث نبوی کی تعلیم سے فراغت حاصل کی، اور ہندوستان کے وہ گرامی قدر محدثین جن کی خدمات وتصنیفات علم حدیث میں سب سے نمایاں اور علمی دنیا میں مسلّم ہیں۔ مثلاً: فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی (شیخ الادب)، حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی اور حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ۔ یہ وہی شیخ الہند محدث اعظم ہیں جو تحریک آزادیٔ ہند کے سرخیل، ریشمی رومال تحریک کے سربراہ اور اسیر مالٹا کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔

●

دارالعلوم دیوبند کے قیام کو پچاس سال گذرنے کو ہیں، بیسویں صدی عیسوی کا آغاز ہے، پوری دنیا میں سیاسی اور جغرافیائی طور پر تبدیلیاں دکھائی دینے لگی ہیں، ایشیا کے بیشتر ممالک جو انگلینڈ یا فرانس کے زیر اثر ہیں اپنی آزادی کیلئے کوشاں ہیں، خود ہندوستان میں جدو جہد آزادی کی تحریک شباب پر ہے، ایسے وقت میں دارالعلوم دیوبند کی علمی شان، قرآن وسنت کے افتخار اور اسلامی علوم کی اشاعت کے سربراہ وہ عظیم شخصیت شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز ہے جو امام العصر، محدث یگانہ، فقیہ اعظم اور غیر معمولی قوت حافظہ کے حامل پوری علمی دنیا کے مستند ہیں، فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلامی دنیا میں جامع العلوم ایسی شخصیت کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ملک و بیرون ملک جملہ علماء ومحدثین اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی دنیا میں اس قدر وسیع العلم اور باعمل علماء کم پیدا ہوئے ہیں، ان کی یادداشت تو ضرب المثل ہے، ایک مضمون یا کتاب کو پڑھ لیا تو سالہا سال تک بعینہٖ تمام باتیں ذہن میں محفوظ رہتیں، تاریخ دارالعلوم

دیوبند میں لکھا ہے:

''حضرت شاہ صاحب کو قدرت کی جانب سے حافظہ ایسا عدیم النظیر بخشا گیا تھا کہ ایک مرتبہ کی دیکھی ہوئی کتاب کے مضامین و مطالب تو درکنار عبارتیں تک مع صفحات و سطور کے یاد رہتیں۔ اسی کے ساتھ مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ جملہ علوم کے خزانے ان کے دامنِ جستجو کی وسعتوں کو مطمئن اور تشنگیٔ علم کو سیراب نہ کر سکتے تھے۔ کثرت مطالعہ اور قوت حافظہ کے باعث گویا ایک متحرک و متکلم کتب خانہ تھے، صحاح ستہ کے علاوہ حدیث کی اکثر کتابیں تقریباً برنوک زبان تھیں۔''

(تاریخ دارالعلوم، جلد دوم ص ۲۰۳)

اور گو کہ حضرت علامہ کشمیری یکتائے روزگار بحر العلوم تھے مگر آپ کی شہرت علم حدیث کی تدریس و تشریح اور تصنیف و تالیف کی راہ سے زیادہ ہے اور بلاشبہ وہ فخر المحدثین اور علّامۂ دہر تھے۔ حدیث کے درس میں مضمون کی تشریح اور فقہی احکامات کی وضاحتیں جس طرح فرماتے بلاشبہ وہ ایک خاص انفرادی طرز تھا جو دارالعلوم دیوبند کا طرۂ امتیاز ہے اور اسی نہج پر کم و بیش آج تک علم حدیث کا درس جاری ہے۔ ان کے درس میں بیٹھ کر اور حضرت علامہ سے ملاقات کر کے مصر کے مشہور زمانہ عالم سید رشید رضا صاحب ''المنار'' نے کہا تھا۔ **مارأیت مثل هذا الاستاذ الجلیل** میں نے اس جلیل القدر استاذ جیسا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ تنہا حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی علمی شخصیت اور علم حدیث کے لیے ان کی خدمات کو دارالعلوم دیوبند کے علم حدیث میں امتیاز ظاہر کرنے کیلئے کافی ہے، جب کہ ان کے ہی دور میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (تقریباً ایک ہزار کتب و رسائل کے مصنف) نگرانِ تصنیف ''اعلاء السنن'' اور حضرت شیخ الہند کے ایک اور شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صاحب فتح الملھم (شرح

عربی صحیح مسلم شریف) کی خدمات حدیث بھی دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک باب ہے، اور حضرت شیخ الہندؒ کے دیگر تلامذہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الدین مرادآبادیؒ، حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ جیسے نامور محدثین علماء بھی ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ حدیث کے درس وتدریس واشاعت میں گذرا۔

پھر جانشین شیخ الہند محدث جلیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے لائق وفائق ویگانۂ روزگار تلامذہ کی فہرست ہے جو دیگر اسلامی علوم کی خدمت کے ساتھ علم حدیث کی خدمت میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں، خاص طور پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ، صاحب معارف السنن (شرح عربی ترمذی شریف) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ مفتی اعظم پاکستان (مؤلف معارف القرآن)، محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (مؤلف التعلیق الصبیح شرح عربی مشکوٰۃ المصابیح)، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ (مرتب فیض الباری)، مولانا قاضی زین العابدین میرٹھیؒ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (مؤلف معارف الحدیث) اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)۔

حکیم الاسلام اور علم حدیث

بانیٔ دارالعلوم دیوبند الامام محمد قاسم النانوتوی علیہ الرحمۃ کے پوتے اور حضرت مولانا محمد احمدؒ مہتمم دارالعلوم کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کا نام دارالعلوم دیوبند کے کسی شعبہ کی خدمت کے ذکر کیساتھ لازمی حصہ بنتا ہے۔ پیدائش علمی گھرانے میں، تربیت وتعلیم اکابر دیوبند کی سرپرستی میں، اور صلاحیتیں منجانب اللہ، ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، حدیث کی خصوصی سند آپ کو وقت کے مشاہیر علماء واساتذہ سے حاصل ہوئی،

اور علم حدیث کی خصوصی تعلیم امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے حاصل کی۔

آپ اس عظیم دینی درسگاہ کے نائب مہتمم پھر مہتمم بنائے گئے، اکابر نے انتخاب کیا، دعائیں دیں، اللہ نے فضل وکرم کا سایہ ڈالا اور ذکاوت وذہانت، فہم و فراست، حسن تدبیر اور ذاتی خصوصیات نے مقبولیت وعظمت کا تاج پہنایا، نصف صدی سے زائد عرصے تک دارالعلوم دیوبند کا اہتمام سنبھالا، ملک و بیرون ملک شہرت دی، دارالعلوم دیوبند کے مقاصد، طریقۂ کار، خدمات اور اسلامیان ہند کے دینی رہنما بنے، مسلک دیوبند کے ترجمان کہلائے، دارالعلوم کے انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ مسند رشد و ہدایت بھی سنبھالا، مگر دارالعلوم کے امتیازی شعبہ تدریس حدیث سے وابستگی ضرور رکھی۔

اہتمام کی ذمے داریوں کے ساتھ درس و تدریس کی مشغولیت برابر رکھی، مختلف علم وفنون کی کتابیں پڑھائیں لیکن عمر کا ایک معتدبہ حصہ تدریس حدیث میں گذرا، اور چونکہ آپ کی طبیعت میں حکیمانہ جوہر و اسرار تھے اسلئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی معروف تصنیف ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا درس بہت مشہور رہا۔ حدیث کی کتابوں میں ابن ماجہ اور مشکوٰۃ شریف کا درس عرصۂ دراز تک جاری رہا، کچھ عرصہ بخاری شریف کا درس بھی دیا، درسِ حدیث میں استاذ گرامی قدر حضرت کشمیریؒ کے علوم کا اثر بھی تھا اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ بھی۔ آپ منقولات اور تشریحات اسلامی کو دلائل عقلیہ سے اس انداز میں ثابت کرتے کہ جس سے ہر دور کا ذہن مطمئن ہو سکے۔

ابتدائے درسِ حدیث میں علم حدیث کی تاریخ، تدوین اور اہمیت پر استدلال ہوتا، پھر محدثین کے طبقات کا ذکر اور منکرین حدیث کے جوابات مکمل تفصیل کے

ساتھ، اسکے علاوہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کا جو نمایاں وصف ''خطابت'' ہے اس میں بھی قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کا ذکر، وضاحت، استدلال اور اسکی تشریحات، چنانچہ خطبات حکیم الاسلام کے نام سے انکے مواعظ اور تقریروں کا جو مجموعہ دس ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے وہ اسکے لئے بیّن ثبوت ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی اہتمام کی مشغولیات، کثرت اسفار اور دعوت و تبلیغ کی مجلسوں کے علاوہ ان کا کارنامہ مضامین لکھنا اور مختلف دینی موضوعات پر تصنیفات کا سلسلہ بھی ہے۔ ان کی تصنیفات میں علم حدیث کا موضوع بھی ہے۔ خاص طور پر اسی کو موضوع بنا کر انھوں نے جو کتابیں تحریر فرمائیں وہ ہیں: حدیث رسول کا قرآنی معیار، حجیت حدیث، نظریۂ دو قرآن پر ایک نظر ۔

حکیم الاسلام
اور
مسند رشد و ہدایت

جب ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں انقلاب کی ناکامی کے بعد سلطنت مغلیہ کا دور ختم ہوا اور اس سرزمین پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہو گیا، تو مسلمانوں اور خاص طور پر علماء کی جماعت کو جس بیدردی سے مٹایا گیا، مسلمانوں کے دینی جذبات اور اسلامی غیرت وحمیت کو بھی کچلا جانے لگا اور اسلامی تہذیب وتمدن کو جس طرح مٹانے کی کوشش کی گئی وہ بڑا ہی پر آشوب اور نازک دور ثابت ہوا۔

ایسے سخت اور صبر آزما دور میں اسلامی تعلیمات اور عقائد کی بقا وتحفظ، کتاب وسنت کی ترویج واشاعت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے سرزمین دیوبند میں ایک علمی درسگاہ اور اسلامی قلعہ دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ دارالعلوم دیوبند کی زائد از یک صدی خدمات آج تاریخ کے صفحات کا ایک روشن باب ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کے دین ومسلک اور اسلامی تعلیمات کا تحفظ اسی دارالعلوم کے ذریعہ ہوا۔

اور موجودہ نصف صدی میں دارالعلوم دیوبند نے قرآن وحدیث، تفسیر وسنت، فقہ وعقائد اور جملہ اسلامی علوم کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں اور

دارالعلوم نے ترقی کی جتنی شاہراہیں طے کیں اس کا سہرا حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سر ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس کو تاریخ کے زریں دور میں شمار کیا جائے گا۔

اور یہ اٹل حقیقت ہے کہ ہندوستان میں زائد از نصف صدی دینی قیادت اور فکری سربراہی کا نمایاں دور حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ہے، دارالعلوم دیوبند کے انتظام واہتمام اور مسلک دیوبند کو زینت تھی حکیم الاسلام سے، ان کی وفات سے یہ زریں عہد ختم ہوگیا۔

حضرت قاری صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی شخصیت جامع اوصاف وکمالات تھی جس کا اعتراف پوری دنیا نے برملا کیا اور عظمت ورفعت کا یہ باکمال پیکر اس حال میں دنیائے فانی سے رخصت ہوا کہ بقول جمیل مہدی ایڈیٹر ''عزائم''، لکھنؤ:

> ''وہ تو اس فانی وآنی زندگی میں اپنا مقرر ومقدر کردار مکمل کر کے چلے گئے لیکن اپنے ساتھیوں اپنے حریفوں، اپنے معترضوں کو اتنی بڑی آزمائش میں مبتلا کر گئے جو دنیا سے زیادہ آخرت سے متعلق اور دنیائے عمل سے زیادہ روز جزاء کے ساتھ وابستہ ہے۔''

حضرت حکیم الاسلام نے دارالعلوم کے اپنے ساٹھ سالہ دور اہتمام میں جو علمی، دینی، فکری اور اصلاحی خدمات انجام دیں ان میں سب سے نمایاں وصف تبلیغ دین اور اصلاح امت ہے جس کا حق منصبی انھوں نے اس طور پر انجام دیا کہ دنیا پکار اٹھی: یہی موعظت وحکمت اور رشد وہدایت کے امام ہیں، بلاتفریق مسلک ومذہب سبھوں نے اس منصب پر حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کو لاثانی ولافانی تسلیم کیا۔

ایک طرف وہ حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علوم ومعارف کے صحیح وارث وجانشین تھے، دوسری طرف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ اجل تھے، چناں چہ علم وحکمت اور اصلاح

امت کے سلسلہ میں اپنے اسلاف کے پیرو کار رہے، آپ نے مسند رشد وہدایت کے اعلیٰ مقام سے تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے علاوہ تبلیغ ودعوت کا اسلامی فریضہ انجام دیا، اسی لیے حضرت کے تبلیغی تقاریر اور وعظ وخطابت آپ کی تابناک زندگی کا مابہ الامتیاز مقام ہے جس سے ہند و بیرون ہند عالم اسلام کا گوشہ گوشہ مستفیض ہوا۔ اور گم کردہ راہ افراد نے ہدایت پائی۔

ہر دور میں خطیب ومقرر نمودار ہوئے، اور بہت سے افراد اسٹیج پر اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے، مگر وہ گفتار کی شیرینی، حکیمانہ اسلوب اور ایمان پرور انداز جو حکیم الاسلام کا خاصہ تھا کہیں اور نہیں ملتا، کسی بھی اجلاس میں مجمع کی کثرت کے لیے لفاظی یا جسمانی ضخامت کو کبھی دخل نہیں رہا۔ ہر بات کتاب وسنت کی روشنی میں، ہر وعظ علم وحکمت پر مبنی، ہر تقریر لطافت اور نزاکت لیے، مناظرانہ خشونت سے دور، انتہائی شگفتگی سے بیان کرنے کا سلیقہ، مسلک دارالعلوم کی توضیح، دینی خدمت کا حقیقی جذبہ، اور سامعین کے دلوں میں اثرانداز ہونے والی نصیحتیں حکیم الاسلام کو امتیاز کا درجہ دیتی ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ ان کے اہل بصیرت معاصرین نے ان کی جامع شریعت وطریقت شخصیت کو ''حکیم الاسلام'' کا لقب دیا تھا، چنانچہ وہ زندگی بھر اپنے عمل وکردار، اپنی ایمان افروز تقریروں اور مواعظ اور دین کی خدمت سے اس لقب کے صحیح مصداق بنے رہے۔

پھر حکیم الاسلام کے اس نمایاں وصف یعنی خطابت کا اہم امتیاز ان کا ہر موقع اور مناسبت کے لحاظ سے اسی موضوع پر کلام تھا۔

کسی تقریب، اجلاس یا نشست میں حضرت مدعو ہوتے تو بلا جھجھک دو تین گھنٹے اسی موضوع پر تقریر فرماتے جس موضوع پر تقریب یا اجلاس ہو اور پھر

سامعین ان کی لطافت بیانی اور بیش بہا معلومات سے مستفید ہو کر یہ کہتے ہوئے اٹھتے کہ آج تک اس موضوع پر اتنا حکیمانہ اور عالمانہ بیان نہیں سنا ہے، دنیا کے کسی موضوع پر بھی ہو حضرت اس طرح بیان فرماتے گویا اسی فن میں ان کو مہارت اور درک حاصل ہے۔ دنیاوی معاملات ہوں، سیاست ہو، تاریخ ہو، جغرافیہ یا اقتصادیات ہو، ادب یا تاریخ ہو، طب یا شاعری ہو، ملکی معیشت ہو، یا خاندانی معاشرت، اجتماعی مسائل ہوں یا انفرادی؛ ہر ایک سلسلہ میں خطاب شروع کرتے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں تشریح وتائید فرماتے۔ دینیات سے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر حضرت نے بصیرت افروز اور حکمت آموز تقریر نہ فرمائی ہو۔

حکیم الاسلام نے مسندِ رشد و ہدایت اور منبرِ وعظ وخطابت سے کسی خاص طبقہ کو نہیں پکارا، ہر جماعت اور ہر مسلک کے افراد کو اپنے حکیمانہ اسلوب سے مستفیض کیا، اسی لیے روشن خیال طبقہ بھی حضرت کی تقریروں میں شرکت کر کے فخر محسوس کرتا اور دنیاوی علوم سے آراستہ افراد بھی ان سے مستفید ہوتے، کیوں کہ ان کے بیان میں علم وحکمت کا خزانہ ہوتا تھا۔ شریعت وطریقت اور اسلامی تعلیمات کا گراں قدر سرمایہ ہوتا تھا۔

ہندوستان کے ہر گوشے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تبلیغ دین اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا اور بیرون ہند، پاکستان، برما، افغانستان، بنگلہ دیش، امریکہ، لندن، افریقہ، اور اکثر عرب ممالک میں حضرت نے اس حق منصبی کو ادا کیا اور دینی دعوت کا فریضہ انجام دیا۔

حکیم الاسلام کو پوری دنیا میں یکساں طور پر مقبولیت حاصل رہی جس کا اعتراف اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند میں مختلف ممالک سے شرکت کرنے والی مقتدر اور رہنما شخصیتوں نے کیا۔ دارالعلوم کے انتظام واہتمام اور اس کی ترقی کی

وجہ سے بھی اور ان کے اس امتیازی منصب کی وجہ سے بھی جہاں سے لاکھوں کروڑوں افراد نے راہِ ہدایت پائی۔

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمی مرحوم نے مسند رشد و ہدایت اور منبر وعظ و نصیحت کو ایسی رونق عطا کی کہ وہ ان کی وفات پر ویران نظر آتے ہیں، خدا ہدایت دے ان کم نفسوں کو بھی جنھوں نے اس عظیم ہستی کے حلم و بردباری اور صبر وقناعت کا امتحان لیا اور ان کی پاک شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کی، آج ایسے افراد بھی ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، انکی عظمت کا اعتراف اور ان کی وفات سے مسلمانوں کی صف میں خلا کا احساس بھی۔ لیکن ؎

ساحل پہ اب نہ جانے کیوں ہاتھ مل رہے ہیں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مختصر تعارف

ہندوستان میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کا اہم مرکز دیوبند کی وہ دینی درس گاہ ہے جسے عالم اسلام میں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی ''دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے جانا جاتا رہا ہے، اس اسلامی وخالص دینی تعلیم گاہ کو گذشتہ نصف صدی میں نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں متعارف کرنے والے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ تھے۔

حضرتؒ کی ولادت با سعادت اس خاندان میں ہوئی جس نے دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور اس گلستان علم کو اپنے خلوص، محنت اور کوششوں سے سیراب کیا تھا، ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۸۷ء میں بانیٔ دارالعلوم کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے گھر پیدا ہوئے، بزرگوں نے دعائیں دیں، اساتذۂ وقت نے تعلیم وتربیت سے نوازا، سات سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، دوسال کی قلیل مدت میں قرآن مجید حفظ کرلیا اور ساتھ ہی قرأت وتجوید میں مہارت حاصل کی۔ پھر فارسی کا نصاب پورا کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم

کے شعبۂ عربی میں داخل ہوئے، خداوند تعالیٰ نے آپ کو فراست، قوت حفظ اور جدوجہد کا جذبہ عطا کیا تھا، اور اساتذہ و اکابرین نے خاندان قاسمی سے تعلق کی بنا پر اپنی خصوصی توجہات سے نوازا۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن، مفتیٔ اعظم مولانا عزیز الرحمٰن، مولانا فضل الرحمٰن، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور والد محترم حافظ محمد احمد علیہم الرحمہ کی خصوصی نگہداشت اور رہنمائی میں تعلیم و تربیت پائی، علامۃ العصر محدث اعظم حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے خصوصی طور پر تلمذ اختیار کیا، ان سے حدیث کی کتابیں بھی پڑھیں اور اپنے زمانہ کے اس ''حافظ عسقلانی'' کے علوم سے مکمل استفادہ کیا۔

سند فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ کو دارالعلوم ہی میں تدریس کے منصب پر فائز کیا گیا۔

خداداد ذکاوت و فراست، خاندانی وجاہت و نسبت اور ان کی اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی، حضرت علامہ کشمیریؒ نے اس جوہر کی تراش خراش اور نکھار کے لئے اپنے اسفار میں بھی ساتھ رکھا، خصوصی اور عوامی مجلسوں میں تقریریں کرائیں۔

۱۳۴۳ھ میں آپ کو دارالعلوم کا نائب مہتمم مقرر کیا گیا، چنانچہ وہ منتظم اعلیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے ساتھ اہتمام کی ذمہ داریوں اور انتظامی امور کے جائزے میں حصہ لیتے رہے، ۱۳۴۸ھ میں اکابر و شیوخ نے دارالعلوم کے بڑے انتظامی اور قائدانہ منصب اہتمام پر آپ کو فائز کیا، اور تاحیات وہ دارالعلوم کے مہتمم رہے۔

اس دوران آپ نے دارالعلوم دیوبند کی خدمات اجاگر کرنے اور ایک عظیم دینی درسگاہ کی حیثیت سے متعارف کرانے کے لئے مختلف ممالک کے سفر کئے،

ہندو پاک و بنگلہ دیش میں تو مستقل اسفار ہوتے۔ اس کے علاوہ افغانستان، برما، سعودی عرب، کویت، عرب امارات، قطر، یورپ کے مختلف ممالک اور امریکہ کے علاوہ افریقہ کے بہت سے ممالک کا دورہ کیا، ان تبلیغی اور دعوتی دوروں میں دارالعلوم کو شہرت حاصل ہوتی رہی، ہندوستان میں واقع اس دینی و اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کے عظیم مرکز کا تعارف ہوتا رہا۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے دور اہتمام ہی میں دارالعلوم کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی، پھر ایک وقت وہ آیا، جب ۱۹۸۰ء میں دیوبند کی سرزمین پر عہد آفریں اور تاریخ ساز اجتماع منعقد ہوا، دارالعلوم کے اس اجلاس صدسالہ میں اسلامی ممالک کے نمائندوں نے دارالعلوم کی مرکزیت اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کی مقبولیت اور عظمت کا اندازہ لگایا۔ عمائدین، علماء اور دانشوروں کے طبقے نے دارالعلوم دیوبند اور اس کے منتظم و مہتمم حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیبؒ کی خدمات وکارناموں کا برملا اعتراف بھی کیا۔

''مسلم پرسنل لاء'' کی حفاظت اور اس کے دفاع کا موقعہ آیا تو ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کا قیام عمل میں آیا، اس کی صدارت کے لئے موزوں ترین اور تمام مسلمانوں کے لئے معتمد شخصیت حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی تھی، اخیر عمر تک بالاتفاق اس متحدہ بورڈ کے صدر رہے اور مسلمانوں کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔

یہ جامع کمالات، پیکر علم وحلم ہستی نہ صرف دارالعلوم کے اہتمام وتولیت سے ہی وابستہ ہو کر رہی بلکہ اپنے خداداد علوم ومعارف کو عام کرنے کیلئے تبلیغ دین اور ردّ باطل میں ہندو پاک کے ہر ہر گوشہ میں پہونچی، ملت کو اپنے بلیغانہ مواعظ اور حکمت ریز خطابات سے مستفید کیا۔ ان کی خطابت کو ملک گیر شہرت حاصل تھی، ان کی تقریر کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں تھی، عوام الناس، اہل علم اور جدید تعلیم یافتہ

افراد یکساں طور پر ان کی تقریر سننے کے مشتاق ہوتے، کسی بھی موضوع پر دو تین گھنٹے تک خطاب کرنا، کتاب وسنت سے استدلال اور علوم و معارف سے لبریز کر دینا ان کا خاصہ تھا۔ ان کی نجی مجلسوں میں بھی علوم کے خزانے ملتے، جب دیوبند میں قیام ہوتا تو بعد عصر ان کی قیام گاہ پر مجلس ہوتی، جس میں حاضرین مختلف سوالات کرتے اور آپ وہی علم و حکمت بیان کرتے جو حجۃ الاسلام بانئ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے ان کو حاصل ہوئے تھے، وہ صحیح معنوں میں ان یگانۂ روزگار ہستیوں کے علمی وارث تھے، اوران کے علوم کو عام بھی کرتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ اجل تھے، ان کی صحبت سے حاصل فیض اور تربیت کو اصلاح باطن کے لئے آپ نے رشد و ہدایت کا طریقہ بھی جاری کیا، ان کی بیعت کا سلسلہ ملک بیرون ملک پھیلا ہوا ہے۔

اپنی مشغولیات اور اسفار کے باوجود انھوں نے حکمت ریز کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، مختلف موضوعات پر تحریر کردہ ان کی کتابوں اور مقالات کی تعداد سو سے متجاوز ہے اور تمام کتابیں اہل علم اور دینی حلقوں میں بیحد مقبول بھی ہیں، ان کی تصنیفات میں بھی قاسمی، انوری اور تھانوی علوم و معارف کی اجتماعیت نظر آتی ہے، دیوبند میں قیام کے وقت دارالعلوم کے انتظامی امور کے علاوہ ان کا زیادہ تر وقت تالیف و تصنیف میں ہی گزرتا اور بحالت سفر ٹرین میں بھی اور اپنی اقامت گاہ میں ناتمام مضامین اور مسودوں کی تکمیل کرتے۔

خداوند قدوس نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو علم وعمل، شریعت وتصوف، تقریر وتحریر ہر چیز میں ایسا بلند مقام عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر علماء کی صف میں ملنا مشکل ہے، علماء میں معتمد اور ثقہ شخصیت اور عام مسلمانوں

میں بھی مقبول۔ وہ اپنی فطری ذکاوت، علمی برتری اور اخلاقی بلندی کے ساتھ ساتھ شخصی عظمت کے پیکر تھے، وہ دیوبند کے فاضل، عالم دین، معلم و مربی، مقرّر وخطیب، ادیب و مصنف، مدبر و منتظم اور مرشد و مصلح کی صورت میں ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ۶/شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء کو وفات ہوئی، جنازہ میں ملک کے مختلف گوشوں اور بیرون ہند سے بھی شریک ہونے والوں کی اتنی بڑی تعداد تھی، جو کسی کی رحلت پر دیوبند میں نہیں دیکھی گئی، دیوبند کے مزار قاسمی میں تدفین ہوئی۔

حضرت حکیم الاسلام
اور
دارالعلوم دیوبند کا دور اہتمام

دارالعلوم دیوبند کے قیام میں جن اہل علم اور بزرگ شخصیات نے حصہ لیا تھا ان میں چھ نام آتے ہیں:

۱-حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی
۲-حضرت حاجی سید عابد حسین دیوبندی
۳-حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی
۴-حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی
۵-حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی
۶-حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی

یہ حضرات نہ صرف قیام دارالعلوم بلکہ اس کے انتظام وانصرام میں بھی شریک کار رہے، یہ حضرات مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے اور دارالعلوم کے اولین معمار بھی، ان کی سربراہی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمارہے تھے، پھر مشترکہ طور پر مدرسہ کی تعمیر اور اخراجات کی تکمیل کیلئے فراہمی سرمایہ میں مصروف

ہو گئے، مگر سربراہ تحریک نے دارالعلوم کے لیے جو دستور العمل مرتب کیا تھا اس میں جمہوری طرز اور عوامی چندے کی ترغیب تھی، اسلئے عامۃ المسلمین سے اپیل کی گئی کہ وہ مدرسہ کا مالی تعاون کریں۔

پھر مدرسہ کی نگرانی اور اس کے انتظام کیلئے باضابطہ طور پر حضرت حاجی عابد حسین صاحب کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا، اس لحاظ سے وہ دارالعلوم کے سب سے پہلے منتظم اور مہتمم تھے، یہ منصب اہتمام دارالعلوم کے آغاز کے ساتھ متعارف ہوا جو اپنی اصطلاحی حیثیت میں اس سے قبل معروف نہیں تھا، اسی وقت سے اہتمام اور مہتمم کا لفظ مدارس اسلامیہ کی تاریخ کا ایک حصہ بن گیا، یہ ایک عہدہ اور منصب تھا جو مدرسے کے نگران اعلیٰ کیلئے مخصوص ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا اہتمام سب سے پہلے حضرت حاجی عابد حسین کے سپرد ہوا جو مجموعی طور پر دس سال تک ان سے متعلق رہا ان کے بعد حضرت مولانا رفیع الدین، حضرت حاجی سید فضل حق، حضرت مولانا محمد منیر نانوتوی اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد سے ہوتا ہوا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی تک پہونچا۔

۱۳۴۱ھ میں مجلس شوریٰ کی تائید و تجویز سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو نائب مہتمم بنایا گیا، گو کہ آپ کو انتظامی امور کی بجائے علمی و تدریسی مشغلہ ہی زیادہ پسند تھا، مگر اکابر کی رائے کی وجہ سے آپ نے نیابت اہتمام کی ذمہ داری سنبھال لی، پھر جب ۱۳۴۸ھ میں صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہو گیا تو مستقل طور پر آپ کو مہتمم بنایا گیا، مجلس شوریٰ کی تجویز یہ تھی:

> ''ہم سب ممبران شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۸؍شوال ۱۳۴۸ھ سے ۲۱؍شوال ۴۸ھ تک دارالعلوم میں رہ کر دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معائنہ کیا، جو امور بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ میں پیش کئے ان کا

بلا رو رعایت تصفیہ کیا، ہم ممبران اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب مولانا قاری محمد طیب صاحب نے زمام اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے ان کے ہر طریق عمل سے صدق و اخلاص نیت، حب و بغض فی اللہ اور ادائے حقوق وفرض شناسی میں عزم قوی اور ثبات و استقلال بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے۔ وللہ الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ“

(تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول ص ۲۸۰)

اس طرح سرپرست دارالعلوم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصویب اور مجلس شوریٰ کی تجویز سے آپ کو اہتمام کی ذمہ داری سپرد کرنے کے ساتھ دعائیں دی گئیں اور نیک تمنائیں اور امیدیں۔ پھر شروع ہوا دارالعلوم دیوبند کی ترقیات وتشہیر کا وہ انقلابی دور جب پوری دنیا میں اس ادارے کی نیک نامی اور حضرت مہتمم صاحب کی سربراہی کا اعتراف کیا گیا اور اسے خراج تحسین پیش کیا جانے لگا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی علمی، تحریری وتقریری خوبیوں اور امتیازات کے علاوہ نظم ونسق اور دارالعلوم کی خدمات کے تعارف کے سلسلے میں اب وہ دیوبندیت کے ترجمان اور علم دین کے عظیم پاسبان کے طور پر معروف ہو گئے۔ اکابر دیوبند نے جو توقعات حضرت مہتمم صاحب سے وابستہ کی تھیں سب پوری ہونے لگیں۔

اس زمانے تک دارالعلوم دیوبند ایک عام دینی درسگاہ کی صورت میں مصروفِ خدمات تھا جہاں چند سو طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور بیرون ہند میں اس کا تعارف بھی نہ تھا، مگر اب ان کے دور میں دارالعلوم کی ظاہری و باطنی، علمی، ملّی وروحانی ترقیات کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا دور اہتمام کم وبیش ۶۰ رسالوں کے طویل عرصے کو محیط ہے، اس دور کی جملہ ترقیات میں بلاشبہ حضرت کی نگرانی اور اساتذہ و کارکنان کی مخلصانہ جدوجہد اور لگن کا بڑا دخل ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ترقیات کا سہرا

حضرت حکیم الاسلامؒ کے سر ہے۔

عام طور پر کسی تنظیم یا ادارے کی ترقیات کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی مالیات اور تعمیرات کو نمایاں کیا جاتا ہے اور کسی حد تک یہ درست بھی ہے مگر دارالعلوم دیوبند صرف ایک ادارہ اور مدرسہ نہیں، کوئی تنظیم یا جمعیت نہیں، بلکہ یہ ایک دینی تحریک ہے جس کی ابتداء اور اس کے مقاصد کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ اس تحریک کو عام کرنے، ملک گیر سطح سے باہر نکال کر عالمی تحریک بنانے اور اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے، پھر ان کا پوری دنیا میں تعارف کرانے کا مکمل کام صرف حکیم الاسلامؒ کی ذات سے وابستہ ہے جو ان ساٹھ سالوں کے دوران پورا ہوا۔ اس دور میں دارالعلوم دیوبند کو ہمہ جہت ترقی، شہرت اور عروج حاصل ہوا۔

متحدہ ہندوستان میں جدوجہد آزادی کی تحریک بھی عروج پر ہے اور علماء وقائدین اس تحریک سے وابستہ ہیں، مگر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام تر سرگرمیاں دارالعلوم کے لئے وقف کر دی ہیں۔ داخلی طور پر اس کی تعمیرات بھی پیش نظر ہیں اور بیرونی طور پر اس کا تعارف اور ملت کی دینی قیادت ورہنمائی بھی مدنظر، چنانچہ حضرتؒ نے ملک کے مختلف علاقوں کے دینی، دعوتی وتبلیغی دورے شروع کئے، ان کی خداداد صلاحیت، خطابت اور حکمت ریز تقریروں نے مقبولیت عامہ حاصل کر لی، اور پھر بیرون ملک ان مقامات کے اسفار شروع ہوئے جہاں مسلمانوں کی آبادی تھی اور جہاں کے اہل علم اور عام مسلمانوں میں حضرت کے بیانات کیلئے طلب اور تڑپ تھی، تقسیم ہند سے پہلے بھی اور بعد میں پاکستان کے ہر علاقے میں سفر ہوا، بیان ہوا، خطاب ہوا اور دارالعلوم کی خدمات کی تشہیر ہوئی، اس کے علاوہ افغانستان، ایران، مصر، افریقہ، امریکہ، برما، یورپ اور بلاد عربیہ کے بارہا اسفار ہوئے جس سے حلقۂ دارالعلوم وسیع سے وسیع تر اور متوسلین دارالعلوم میں

اضافہ ہوتا رہا۔

ان اسفار میں دعوت وتبلیغ، اصلاح معاشرہ، ملّی اتحاد اور قرآن وسنت موضوع خطاب رہے، وہیں دارالعلوم کا تعارف، اس کی خدمات کا تذکرہ، ضروریات کا اظہار بھی ہوتا رہا، اس میں سرفہرست مسلک اہل سنت والجماعت کی ترجمانی تھی جو مسلک دیوبند کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ترجمانیٔ مسلک دیوبند اور بدعات کے خاتمے کیلئے ان کی حکمت اور مواعظ حسنہ ہی ان کے دور اہتمام کی تنہا خدمت کو بھی مان لیا جائے جو ایک تاریخی حقیقت ہے تو پھر ان کے دور کی مزید ترقیات کے ذکر کی بھی ضرورت نہ ہو اور یہی کارنامہ سب سے نمایاں اور ممتاز بن جاتا ہے۔

مگر ہم یہاں اندرون دارالعلوم دیگر ترقیات کا بھی ایک سرسری جائزہ پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

تعمیرات اور شعبہ جات کی تفصیل اس طرح ہے:

۱-نودرہ

۲-دارالطلبہ قدیم

۳-مسجد دارالعلوم دومنزلہ

۴-کتب خانہ کی وسیع عمارتیں

۵-دارالحدیث

۶-فارسی خانہ

۷-دارجدید احاطہ مولسری

۸-احاطہ دفتر اہتمام

۹-احاطہ باغ

۱۰-دارالحدیث فوقانی

۱۱-دارالتفسیر

۱۲-دارالافتاء

۱۳-احاطہ مطبخ

۱۴-مہمان خانہ

۱۵-دارالاساتذہ

۱۶-باب الظاہر

۱۷-جامعہ طبیہ

۱۸-افریقی منزل قدیم

۱۹-افریقی منزل جدید

۲۰-عقب دارالعلوم

۲۱-عقب دارالتربیت

۲۲-دارالشفاء، دارالعلوم پریس

۲۳-رواق خالد

۲۴-جنریٹر روم

اگرچہ دارالعلوم کی تحریک شروع ہوئی تو درس وتدریس کا آغاز مسجد چھتہ سے ہوا جو قدیم مسجد ہے اور جہاں انار کا درخت ہوا کرتا تھا مگر باضابطہ طور پر دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی عمارت ''نودرہ'' ہے جس کی بنیاد ۱۲۹۲ھ میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک سے ڈالی گئی اور جس کی بنیاد میں ایک ایک اینٹ حضرت نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حاجی سید عابد حسین اور میاں جی منے شاہ نے بھی اپنے ہاتھوں سے رکھی تھی۔ (تاریخ دارالعلوم، جلد اول)

اس طرح مسجد دارالعلوم کی عمارت حضرت کے دوراہتمام سے قبل تعمیر ہوچکی تھی مگر اس کا صحن اور اس کی بالائی منزل، اس کے احاطے میں شمال وجنوب کے کمرے اور مشرق میں دارالافتاء وغیرہ کی تمام عمارتیں قاری صاحب کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔

ان کے علاوہ باقی جو عمارتیں ان کے اہتمام سے پہلے شروع ہوچکی تھیں ان سب کی تکمیل ان کے دور میں ہوئی جیسے کتب خانہ، دارالحدیث تحتانی وغیرہ۔ باقی ماندہ تمام تعمیرات ان کے زمانے میں شروع ہوئیں اور ان کے ہی عہد میں اجلاس صد سالہ منعقدہ ۱۹۸۰ء تک مکمل ہوچکی تھیں۔ ان میں دارالحدیث تحتانی، فوقانی، دارالتفسیر، چند درسگاہوں اور نودرہ پر مشتمل وہ مجموعہ عمارات ہے جو عظیم الشان اور پُرشکوہ ہے جس کی تصویر آج بھی دارالعلوم دیوبند کی شناخت ہے، اس کی عظمت وشوکت اور خوبصورتی بے مثال ہے۔ ان کے علاوہ باب الظاہر کی شکل میں قابل دید حصہ اور دومنزلہ دارجدید کی عمارتیں بھی ہیں۔

اسی طرح دارالعلوم دیوبند میں ابتداءً چند شعبے تھے مگر عہد حکیم الاسلام میں شعبہ جات کی تعداد بیس سے بھی تجاوز کرگئی اور جو شعبے جاری تھے ان کا دائرۂ عمل بھی کئی گنا بڑھ گیا۔ ذیل میں ان شعبوں کا ایک اجمالی جائزہ بھی پیش ہے۔

جامعہ طبیہ وعظمت ہسپتال

طب کی تعلیم ابتدا ہی سے دارالعلوم دیوبند کے نصاب کا ایک ضمیمہ تھی، مگر باضابطہ طور پر اس کی تشکیل حضرت حکیم الاسلام کے دور میں ہوئی اور جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کا آغاز ہوا، چارسالہ نصاب پر مشتمل D.U.M. (ڈپلومہ ان یونانی میڈیسن) کی تعلیم شروع ہوئی جس کے فیض یافتہ اطباء ملک کے طول وعرض میں مصروف خدمت ہیں اور بعض اطباء اتنے مقبول ہیں کہ ان کے یہاں مریضوں

کا رجوع دوسرے ڈگری یافتہ ڈاکٹروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی دور میں جامعہ طبیہ کی خوبصورت عمارت سے ملحق علاج ومعالجہ کیلئے ایک شفاخانہ وجود میں آیا جو آج بھی عظمت ہسپتال کے نام سے معروف ہے۔

واضح ہو کہ یہ شعبہ ۱۹۸۵ء میں دارالعلوم کی عمارت پر قابض جدید انتظامیہ نے ختم کردیا ہے اوراس کی عمارت بھی منہدم کردی گئی ہے۔

تجوید

اس کا آغاز اگرچہ استاذ القراء حضرت مولانا عبدالوحید صاحب الٰہ آبادی کے زمانے سے ہو چکا تھا اور حکیم الاسلام ان کے اوّلین تلامذہ میں سے تھے، مگر ۱۳۵۱ھ سے تجوید کی مشق فضلائے دارالعلوم کی سند کے لئے لازم قرار دی گئی۔ پھر بتدریج شعبۂ تجوید وسیع تر ہوگیا، حضرتؒ کے عہد میں اس شعبہ کے آخری مقبول وممتاز صدر القراء قاری حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم تھے۔

دارالافتاء

اس کا قیام عملی طور پر ۱۲۹۲ھ میں ہو چکا تھا لیکن باقاعدہ ایک شعبے کی حیثیت ۱۳۱۰ھ میں اس نے اختیار کی اور دارالعلوم کی ابتدائی عمارتوں میں مفتیان کرام یہ خدمت انجام دیتے رہے، البتہ اس کی مستقل عمارت حکیم الاسلامؒ کے دور میں تیار ہوئی، ۱۳۸۶ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، یوں تو فتاویٰ دارالعلوم کے مجموعہ کی اشاعت اس کے عظیم المرتبت مفتیان کرام کے عہد میں ابتداءً ہو چکی تھی جس کی ترتیب ہندو پاک کے مسلمہ مفتیٔ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے فرمائی لیکن پھر حضرت حکیم الاسلام کے ایماء پر دارالعلوم کے اولین اور عظیم القدر مفتیان کرام کے ہزارہا فتاویٰ کی ترتیب وانتخاب کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی اور گویا دارالعلوم کے ایک صدی کے فتاویٰ کو مرتب اور مبوب کر کے شائع کیا گیا جس کو حواشی اور حوالہ سے

مزین کرنے کی خدمت معروف اہل قلم مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے انجام دی جس کی اب تک ایک درجن سے زائد جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

کتب خانہ

پہلے کتب خانہ ایک بڑے ہال اور دو ایک ملحقہ کمروں پر مشتمل تھا، حضرت حکیم الاسلامؒ کے عہد میں دو بڑے ہال کمرے، تالیفات علماء دیوبند کے لئے ایک مستقل ہال اور مزید کمرے تعمیر کئے گئے، اس طرح کتب خانہ دارالعلوم کی عظیم و پُرشکوہ عمارت وجود میں آئی، کتب خانہ میں موجودہ ذخیرۂ مخطوطات کا کچھ اجمالی تعارف مؤلف تاریخ دارالعلوم اوّلاً سید محبوب رضوی مرحوم کے قلم سے سامنے آیا اور آخر میں مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے اس پر قدرے تفصیلی کام کیا جو شائع ہو چکا ہے۔

رسائل وجرائد

دارالعلوم کے احوال وکارگذاریوں کے تعارف کیلئے پہلے سے کوئی شعبہ قائم نہ تھا تاہم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کی سرپرستی میں ۱۳۳۱ھ میں رسالہ ''القاسم'' اور پھر ماہنامہ ''الرشید'' جاری کیا گیا جو ۱۳۴۱ھ تک جاری رہا جن میں دارالعلوم کے ممتاز اہل قلم، فضلاء، اساتذہ کے علمی اور تبلیغی مضامین شائع ہوتے تھے، پھر ۱۳۶۰ھ میں حکیم الاسلام کی زیر سرپرستی رسالہ ''دارالعلوم'' جاری کیا گیا، جس میں علمی دعوتی اور اصلاحی مضامین کے علاوہ کوائف دارالعلوم کا بھی ایک مستقل عنوان قائم کیا گیا۔ اسی دہائی میں ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک عربی رسالہ بھی شائع کیا جائے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو خود بھی عربی زبان وادب کے فروغ اور عرب ممالک کی شخصیات سے رابطے سے دلچسپی رہی، اسلئے ایک سہ ماہی رسالہ ''دعوۃ الحق'' مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ کی ادارت میں جاری ہوا جو طباعتی دشواریوں کی وجہ

سے چند سال کے بعد بند ہوگیا، مگر ۱۹۷۶ء میں حضرت مہتمم صاحب نے عربی رسالے کے اجراء پر زور دیا اور باضابطہ ایک دفتر قائم ہوا جس سے پندرہ روزہ ''الداعی'' کی اشاعت شروع ہوئی اس کی نگرانی ابتدا میں مولانا وحیدالزماں صاحب نے فرمائی اور مولانا بدرالحسن قاسمی اور راقم الحروف معاون کے طور پر ۱۹۸۲ء تک شامل رہے۔ اس اخبار نے عرب ممالک کے اہل علم وقلم میں ایک مقام حاصل کیا اور اسے عربی رسالوں میں مقبولیت ملی۔

شعبۂ تبلیغ

اصلاح ودعوت کا کام اگرچہ ہر فاضل دیوبند کے مقاصد حیات میں شروع سے شامل رہا، مگر ۱۳۵۲ھ سے دارالعلوم میں اسے باقاعدہ شعبے کی حیثیت دی گئی، جس کے تحت مبلغین ومقررین حضرات ملک کے طول وعرض میں اس فریضے کو مسلسل انجام دینے لگے۔

شعبۂ تنظیم وترقی

مدارس کے معمول کے مطابق دارالعلوم کے لئے تحصیل چندہ کا کام تو پہلے سے ہوتا رہا مگر اس کے لئے ایک مستقل شعبہ کی تشکیل حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے عہد میں کی گئی، چنانچہ سفراء کی تعداد حضرتؒ کے دور میں ہی دو درجن کے قریب ہوچکی تھی، پھر اس شعبہ کے تحت طلبۂ دارالعلوم کے لئے گیہوں کی فراہمی کا کام غلہ اسکیم کے نام سے شروع کیا گیا، جس میں دارالعلوم کے ممتاز اکابر کی بھرپور تائید حاصل ہوئی اور غلہ اسکیم کا یہ سلسلہ دارالعلوم کے لئے بڑا سودمند اور معاون ثابت ہوا۔

شعبۂ دارالصنائع

یہ شعبہ بھی حکیم الاسلامؒ کے دور اہتمام میں قائم ہوا، جس میں بائنڈنگ،

ٹیلرنگ، چرم دوزی، بیگ اور ہولڈال کی تیاری اور ٹرینگ کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا جس سے طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے فائدہ اٹھایا۔

شعبۂ خوشخطی

یہ فن اپنی جگہ جو اہمیت رکھتا ہے وہ ظاہر ہے مگر مدارس میں عام طور پر اس کی اہمیت محسوس نہیں کی جاتی، حضرت حکیم الاسلامؒ نے اس شعبہ کی اہمیت کو محسوس کیا اور آپ کی توجہ و تجویز کے تحت شعبۂ خوشخطی ملک کے نامور اور مسلّمہ خطاط مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ کی سرپرستی میں قائم کیا گیا اور آج اس شعبہ کے فیض یافتہ فضلائے دارالعلوم ملک کے انگنت جرائد ورسائل میں برسرِ معاش ہیں۔

شعبۂ تعمیرات

دارالعلوم کی موجودہ تعمیرات نودرہ اور احاطۂ مولسری بالکل ابتدائی تعمیریں ہیں، باقی عمارتوں میں مسجد دارالعلوم، کتب خانہ کا قدیم حصہ، تحتانی دارالحدیث، درجۂ فارسی، احاطۂ دفتر اہتمام اور احاطۂ باغ نامکمل حالت میں تھیں، جن کی تکمیل حکیم الاسلامؒ کے دور میں ہوئی، ان کے علاوہ دارِ جدید، دارالحدیث فوقانی، دارالتفسیر، دارالافتاء، احاطۂ مطبخ، افریقی منزل قدیم و جدید، جامعہ طبیہ، مہمان خانہ، دارالمدرسین، دارالعلوم پریس اور رواق خالد کا ابتدائی حصہ اور دارالعلوم کی تاریخ کا نقطۂ آغاز، مسجد چھتہ کی تزئین وتجدید۔ یہ سب عمارتیں حکیم الاسلامؒ ہی کے زمانے میں تیار ہوئیں، دارالعلوم کی موجودہ شاندار عمارات کا تقریباً دوتہائی حصہ ہمیشہ حکیم الاسلام کے تعمیری عہد کی یاد دلاتا رہے گا۔

مطبخ

ابتداءً دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کے لئے یکجا طور پر کھانا تیار ہونے

اور تقسیم کرنے کا نظم قائم نہیں تھا بلکہ مقامی طور پر ہمدردان و بہی خواہان مدارس میں سے باوسعت اور اہل ثروت حضرات کے یہاں ایک ایک دو دو طلبہ کے کھانے کا نظم ہوتا تھا اور طلبہ صبح و شام مقررہ مکانات سے جا کر اپنے کھانے حاصل کر لیتے تھے۔ چنانچہ دارالعلوم کی بالکل ابتدائی رودادوں میں دیوبند کے ان حضرات کا مستقل نام شائع ہوتا رہتا تھا جو اپنے یہاں سے طلبہ کو کھانے دیتے تھے، بعد میں ۱۳۲۸ھ میں طلبہ کی کثرت اور اجتماع کی وجہ سے مطبخ کا مستقل شعبہ قائم ہوا، پھر بتدریج طلبہ کی زیادتی کی بناء پر اس شعبہ میں وسعت ہوتی چلی گئی اور پھر پڑھنے والے طلبہ کی کثیر تعداد مطبخ ہی کے ذریعہ دونوں وقت کے کھانے سے بہرہ اندوز ہونے لگی، جب کہ امدادی اور مستحق طلبہ کے ساتھ ساتھ کچھ ذی حیثیت اور مستطیع لڑکے مطبخ سے قیمتاً کھانا حاصل کرتے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ کے دور میں مطبخ سے کھانا لینے والے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ پہنچ چکی تھی، جس کے کھانے کا معیار اوسط درجہ کا ہوتا، ایک وقت گوشت اور ایک وقت مختلف دالیں اور کبھی کبھی چاول طلبہ کو دیئے جاتے یہ کام بڑی خوش اسلوبی اور نظم کے ساتھ جاری رہا۔

شعبۂ اوقاف

دارالعلوم کا آغاز ہی وقف زمینوں سے ہوا، اگرچہ تعلیمی سلسلہ مسجد چھتہ میں شروع ہوا تھا، مگر دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر عمومی طور پر موقوفہ زمینوں پر ہوئی، پھر بتدریج دارالعلوم کے لئے مقامی طور پر اور ملک کے مختلف حصوں میں اہل خیر حضرات نے جائیدادیں بڑی تعداد میں وقف کیں، جس میں صحرائی اور سکنائی دونوں طرح کی جائیدادیں شامل ہیں، موقوفہ جائیدادوں کی آمدنی سے نفع اندوز ہونے کے لئے شعبۂ اوقاف کا قیام عمل میں آیا، جو مکانات کے کرائے بھی وصول کرتا اور زرعی زمینوں کی پیداوار سے بھی دارالعلوم کا جو مفاد واجب الوصول ہوتا

اس کو بھی حاصل کرتا۔ اس شعبہ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے عہد میں بڑی حیثیت اختیار کر لی اور اس کے نظم کو شعبۂ محاسبی سے الگ کر کے ایک مستقل دفتر کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس ذیل میں اس بات کی نشاندہی تاریخ کا بھی تقاضہ ہے اور دیانت واخلاق کا بھی کہ جس شعبہ کی بنیاد پر دارالعلوم کی عمارتیں آج کھڑی نظر آتی ہیں، اپنی کچھ قانونی مجبوریوں اور ذہنی ژولیدگیوں کی بناء پر حکیم الاسلامؒ کے مدّمقابل آنے والے بظاہر خداترس اور مدعیان زہد وتقویٰ اکابر وقت نے وقف کی اس بنیاد ہی کو ختم کر دیا جس پر گویا دارالعلوم کی یہ پرشکوہ عمارت قائم ہے، برملا برسرعام اور روبروئے عدالت واشگاف لفظوں میں یہ کہہ کر تاریخ دارالعلوم کو جھٹلا دیا گیا کہ دارالعلوم کی کوئی جائیداد وقف نہیں ہے اور نہ وقف سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

بہرحال یہ حقیقت بطور ایک جملہ معترضہ درمیان میں آ گئی جو واجب الاظہار تھی۔ وائے گر پسِ امروز بود فردائے۔

شعبۂ برقیات

دارالعلوم چونکہ رفتہ رفتہ ایک بڑے رقبہ اور وسیع وعریض عمارات کی شکل اختیار کرتا گیا، اس لئے اس کے تحت دارالاقامہ، درسگاہوں، شعبہ جات، دفاتر اور ضروریات کا دائرہ بھی پھیلتا چلا گیا، اس ضمن میں صفائی، حفظان صحت، آب رسانی، روشنی اور برقی پنکھوں کی تنصیب اور ان جملہ امور کی دیکھ بھال ایک اہم ذمہ داری تھی، اس شعبہ کا بھی مستقل قیام حضرت حکیم الاسلامؒ کے دور میں ہوا اور بتدریج اس شعبہ کی اہمیت اور ضرورت بڑھتی چلی گئی۔

شعبۂ نشر واشاعت

رسائل و جرائد کے علاوہ دارالعلوم کی علمی، تبلیغی اور اصلاحی خدمات کے تعارف کے لئے کچھ ہلکے پھلکے اور مختصر عوامی لٹریچر کی ضرورت محسوس کی گئی جس کے

ذیل میں دیگر اکابر مدرسہ کے مشوروں اور تجویز کے تحت ابتداءً وقف کی ان مختلف تحریکات کے ردّ میں جو علماء حق کے نزدیک مسلک جمہور سے مختلف اور اہل حق کے مشرب سے ہٹی ہوئی محسوس کی گئیں دارالعلوم کے اہل قلم اساتذہ اور اہل علم سے متعدد کتابچے اور پمفلٹ مرتب کرائے گئے، جنھیں شعبۂ نشر و اشاعت نے شائع کیا اور ان کو عوام تک پہنچانے کی وقت کے ذرائع ابلاغ کے مطابق کوششیں کی گئیں، لیکن اس وقتی اور ہنگامی خدمت کے علاوہ اس شعبہ نے بڑا کارنامہ سوانح قاسمی اور تاریخ دارالعلوم کی اشاعت کا انجام دیا، پھر تیسری اہم ترین خدمت فتاویٰ دارالعلوم کی اشاعت ہے ان کے علاوہ بھی درسیات کی متعدد کتابیں شائع کی گئیں جو نصاب دارالعلوم میں شامل ہیں۔

دارالاقامہ

طلبہ کی اقامت گاہوں کے ساتھ ساتھ ان کے نظم و انصرام اور ان کی نگرانی کا مسئلہ بھی اہم ہے، دارالعلوم میں ابتداءً طلبہ کے قیام کی جو ممکنہ سہولتیں میسر تھیں ان کی دیکھ بھال دفتر اہتمام ہی براہ راست کرتا تھا، لیکن جوں جوں طلبہ کی کثرت اور قیام گاہوں کی تعمیر ہوتی چلی گئی اس کی نگرانی اور نظم کے لئے بھی ایک مستقل دفتر کی ضرورت محسوس کی گئی، آخر کار حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کے عہد میں یہ بھی ایک باقاعدہ شعبہ کی شکل اختیار کر گیا، اس میں سال بسال یا کچھ مزید وقفہ سے انتظامی صلاحیت اور تربیتی ذہن رکھنے والے مؤقر اساتذہ میں سے کچھ افراد کا انتخاب کیا جاتا اور انھیں دارالاقامہ کی یہ ذمہ داری سپرد کی جاتی۔

دفتری امور کے لئے ایک مستقل محرر کا تقرر کیا جاتا رہا، اس شعبہ کے تحت حضرات اساتذہ مختلف احاطوں میں طلبہ کی رہائش کا مناسب نظم کرتے اور طلبہ کی نگرانی اور پرداخت کے فرائض انجام دیتے، گاہ بگاہ مقررہ قیام گاہوں پر طلبہ کی

حاضری بھی لی جاتی، اوقات نماز میں طلبہ کی غیر حاضری کا نوٹس لیا جاتا، بلاضرورت اور بلا جواز غیر تدریسی مصروفیات اور شہری ہنگاموں اور میلوں ٹھیلوں کی دلچسپی یا وقت گذاری پر سخت تنبیہ اور تادیبی کارروائی کی جاتی، اس طرح شعبۂ دارالاقامہ اپنی نوعیت میں یوں تو ایک معمولی سا شعبہ تصور کیا جاتا مگر عملاً وہ طلبہ کی تربیت اور نگرانی کے سلسلہ میں دفتر اہتمام کا زبردست عملی معاون ثابت ہوا، اور اس کی رپورٹوں پر طلبہ کے داخلے اور اخراج کی کارروائی بھی ہوتی رہی۔

دارالعلوم کے اقامت پذیر کثیر طلبہ کی وجہ سے دارالاقامہ کی ذمہ داری برابر بڑھتی چلی گئی اور اس میں بالعموم درجۂ علیا کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی رہیں۔

دارالعلوم پریس

اجلاس صدسالہ سے چند سال قبل اس شعبے کا آغاز ہوا، دارالعلوم کی رسیدات، لیٹر پیڈ اور دوسری دستاویزات کی طباعت کیلئے پریس قائم کیا گیا، جس میں بلاک سے طباعت ہوتی تھی یا انگریزی اور عربی کے ٹائپ والے حروف سے، ٹائٹل وغیرہ کی رنگین طباعت کا سہل الحصول طریقہ اس وقت یہی تھا۔

طلبۂ دارالعلوم

دارالعلوم اپنے دور آغاز ہی سے شہرت پذیری کے جس مقام پر پہنچ گیا تھا اس کے ابتدائی سالوں ہی میں ہندوستان کے دور دراز علاقوں کے طلبہ نیز افغانستان اور سمرقند و بخارا تک کے طالب علم یہاں آنے لگے، طلبہ کی تعداد سال بسال بڑھتی چلی گئی، حتیٰ کہ حکیم الاسلامؒ کے دور میں یہ تعداد دو ہزار تک جا پہنچی اگر تقسیم ہند کا حادثہ پیش نہ آتا تو ۳۰/۳۵ سالوں میں یہ تعداد یقینا دوگنی ہوجاتی جب کہ تقسیم ہند کے بعد اور بنگلہ دیش بننے کے بعد ان دونوں علاقوں میں علماء دیوبند نے بڑے بڑے مدارس قائم کئے جو حقیقتاً دارالعلوم ہی کی شاخیں کہلانے کے مستحق ہیں۔

عملۂ دارالعلوم

آپ کے عہد میں کارکنانِ دارالعلوم کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہوا، مدرسین و ملازمین کی تعداد ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء میں ۲۷۵ر کے قریب ہوچکی تھی، غرض دارالعلوم کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو وہ نظری ہو یا علمی، عملی ہو یا تعمیری، ایسا نہیں جس میں آپ کے دور میں کوئی اضافہ نہ ہوا ہو، اور کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اس کی ترقی محسوس ومشاہد نہ ہو، تاہم طلبہ کی اتنی بڑی تعداد، اساتذہ وکارکنان کے اتنے بڑے عملہ کے ساتھ حکیم الاسلامؒ کا تعلق اور برتاؤ شفقت و مروّت، نرم خوئی اور خوش خلقی پر مبنی ہوتا، انتظامی امور اور دفتری احکامات کے لب ولہجہ میں بھی اس کی رعایت ملحوظ رہتی اور حضرتؒ کی ذات اور نسبت قاسمی کے احترام کے پیش نظر عظیم المرتبت اساتذہ اور وقت کے جلیل القدر اکابر بھی آپ کی پیشوائی میں چلنے اور آپ کی رائے کو بسر وچشم قبول کرنے میں کوئی تامل نہ کرتے۔ اور آپ کے حلم وبردباری، اعتدال پسندی اور میانہ روی ہی کے نتیجے میں دارالعلوم تقسیم سے قبل کے سیاسی ہنگاموں میں اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکا۔

اس آخری دور کو چھوڑ کر دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں دخیل رہنے والی بڑی بڑی شخصیتیں آپ کو منصب اہتمام پر باقی رکھنے کے لئے مجبور رہیں، جب کہ سیاسی اختلاف اور ذہنی بُعد نے حضرت حکیم الاسلامؒ کے بارے میں انھیں طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلط اندیشیوں میں مبتلا بھی کیا اور اس کے نتیجے میں کچھ نچلی سطح کے لوگوں نے آپ کے خلاف کچھ منصوبے بھی تیار کئے مگر آپ کی مضبوط قوت ارادی اور مستقل مزاج شخصیت کے سامنے بڑے بڑے طوفان بگولوں کی طرح اٹھے اور آپ کے حلم وشفقت اور حسنِ تدبیر کی بدولت گرد کی طرح بیٹھ گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا دور

اہتمام دارالعلوم کا زریں دور ہے، جس میں دارالعلوم کی جملہ ترقیات کا نصف سے زائد حصہ اسی دور کی رہین منت ہے۔ اسی لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت ایک عالم دین، خطیب بے مثال اور نمونۂ اسلاف ہونے کے ساتھ صرف ''مہتمم صاحب'' کے مختصر نام سے بھی ملک و بیرون ملک جانے جاتے تھے، حلقۂ دیوبند میں خاص طور پر اور اہل علم کے یہاں عام طور پر جب کہا جاتا تھا کہ ''حضرت مہتمم صاحب'' کا بیان ہے یا یہ کہ مہتمم صاحب تشریف لا رہے ہیں تو بغیر کسی تعارف کے سمجھ لیا جاتا تھا کہ مراد حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہیں۔ اہتمام کے لفظ کی جامعیت و معنویت ان کی شخصیت کا ایک تعارف تھی اور امتیاز، اور ان کا وصف نہیں بلکہ نام ہی کا ایک جز و لاینفک۔

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

وفات کے بعد

اجلاس صد سالہ بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا لیکن اسی کے جلو میں اس فتنے کا آغاز ہوا جس کی بنیاد سالہا سال پہلے بعض افراد سیاست وارباب ہوسِ اقتدار نے ڈال دی تھی، پھر اس فتنے کی پرورش و پرداخت ہوئی، ''اصلاح'' کے عنوان سے اقتداری دست و برد نے کیا کیا گل کھلائے، سب اصحاب بصیرت اور تاریخ کی یادداشت میں محفوظ ہیں، عام مسلمانوں اور مخلصین دارالعلوم کو بظاہر کامیاب ترین سازش کے ذریعہ سیاہ بادلوں کے اندھیرے میں لاکر حقیقت کی روشنی کو چھپانے کی کوششیں کی گئیں، وقت گذرتا گیا اور پروپیگنڈے کی گھٹا چھٹنے لگی، حقیقت آشکارا ہوئی تو چشم بینا نے دیکھا کہ ''دارالعلوم دیوبند'' کو عالمگیر بنانے والی شخصیت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور قدیم باصلاحیت اساتذہ و کارکنان پر مشتمل ۸۵/ افراد دارالعلوم کی عمارت سے باہر ہیں، ان

عمارتوں اور ان کی مقبولیت وشہرت پر غیر اخلاقی وغیر آئینی قبضہ جمانے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی تمام تر ''جدوجہد'' سے اقتدار اور قبضے کی کنجی اپنی مٹھی میں کر لی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے وہ معماران جن کی زندگی کا بیشتر حصہ دارالعلوم دیوبند کیلئے وقف تھا اور اس قافلے کے وہ سربراہ جنھوں نے دارالعلوم کو عالمگیر بنایا تھا اور فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں جن کا نام تاریخ دارالعلوم میں سب سے نمایاں اور سرفہرست تھا وہ سب کے سب دارالعلوم دیوبند کے اغراض ومقاصد، بنیادی حیثیت (بطور مرکزی دینی تعلیمی اور وقف) اور علمی سرگرمیوں کو باقی اور جاری رکھنے کے عزم سے ''دارالعلوم وقف دیوبند'' کے عنوان پر دیوبند کی جامع مسجد میں مصروفِ خدمت ہوئے۔

ابھی غالباً سازش کی تکمیل نہیں ہوئی تھی اسلئے اس عظیم ہستی کے خلاف جو دارالعلوم دیوبند ہی کا دوسرا نام تھی مختلف انداز کے الزامات عائد کئے گئے، غبن، خیانت، اقربا پروری اور کبرسنی کی وجہ سے ضعف دماغی کے الزامات بھی شامل تھے۔

حد تو اس وقت ہوگئی جب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی وفات ہوئی تو یہی طبقہ اور اسی کے افراد حضرت کی مدح سرائی میں مشغول ہوگئے، ان کی رحلت کے بعد رسائل وجرائد کے خصوصی شمارے شائع ہونے لگے، اسی دوران حضرتؒ کی خدمات پر مشتمل ایک صاحب نے ''تذکرہ طیب'' نامی کتاب مرتب کی، جس میں مختلف اہل علم کے مضامین شامل تھے، مؤلف یہاں نہ ان پر تبصرہ کرنا چاہتا ہے نہ تنقید، اسی تذکرۂ طیب میں ایک مضمون ایسا بھی تھا جو حقائق سے لبریز، غیر جانبدار، نظر کشا اور بصیرت افروز تھا، صاحب قلم ملک کے مشہور عالم دین، فقیہ ومحدث حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی (فاضل دیوبند) استاذ دارالعلوم

ندوۃ العلماء لکھنؤ ہیں۔ اس کتاب میں ان کا وہ تاریخی مقالہ شامل کر رہا ہوں جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کے ساتھ ساتھ اس وقت کے حالات پر کچھ اشارے اور بے لاگ تبصرے بھی ہیں۔

فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں
حضرت حکیم الاسلام کا حصہ

از: حضرت مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ایسی کسی شخصیت پر قلم اٹھانا، نسبتاً آسان ہوتا ہے جو بس ایک دوخوبیوں کی مالک یا چند صفات میں ہی امتیاز رکھتی ہو لیکن ایسے افراد میں سے کسی پر کچھ لکھنا جو عبقری صفت اور گوناگوں خصوصیات کے حامل ہوں، اور جن کے محاسن بے شمار ہوں اور جو صفات حمیدہ کا مجموعہ ہوں ان پر لکھنا کاتب کیلئے ایک طرح کا امتحان ہوتا ہے کیوں کہ تمام خصوصیات کا بیان اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا۔ بالخصوص کسی مقالہ میں ممکن نہیں ہوتا اور پھر یہ فیصلہ کرنا کہ ان اوصاف میں سے کسے موضوع بنایا جائے اور کسے چھوڑا جائے حیران وسرگشتہ کرنے کا موجب ہوجاتا ہے۔

ایسے جامع صفات اور مجموعۂ کمالات افراد میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی ذات گرامی بھی تھی، کہ گلستان قاسمی کے اس گل سرسبد وصد رنگ کے کس رنگ کو چنے اور کس سے صرف نظر کرے اور اس کے سامنے یہ

شاعرانہ تخیل

دامن نگہہ تنگ وگل حسن تو بسیار

گل چیں زتنگئ داماں گلہ دارد!!

حقیقت بن کر کھڑا ہو گیا، کیوں کہ گل حسن کی بسیاری پر تنگئ داماں کا گلہ، کسی اور جگہ استعارہ وکنایہ یا مبالغہ ہوتو ہو، مگر حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی ذات میں تو واقعتاً، گلہائے گونا گوں، اس طرح پیوست ہو گئے تھے کہ ان کا شمار مشکل، مزید برآں یہ کہ آں ممدوح کی شخصیت کا ہر پہلو ''کرشمہ دامن می کشد کہ جا اینجا است'' کا سچا نمونہ ہونے کی وجہ سے لکھنے والے کا دامن پکڑتا ہے کہ مجھے نہ چھوڑو۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ اچھا ہوتا اگر برادر موصوف ''تذکرہ طیب'' کے ہر تذکرہ نگار کے لئے، حیات طیب، کا ایک گوشہ، بطور موضوع مقرّر کر دیتے کہ اس طور پر محاسن کے اس گلدستہ کا، ایک درجہ میں سراپا ان کے سامنے بھی آجاتا جنھیں اب صرف مرحوم کی، موئے قلم کے ذریعہ کھینچی تصویر ہی دیکھنے کو مل سکے گی۔

سب کہاں کچھ لالۂ وگل میں نمایاں ہوگئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

لیکن جب ایسا نہیں کیا گیا تو راقم نے مرحوم کی زندگی کا وہ پہلو پیش کرنا طے کیا، جس پر خیال ہے کسی اور نے (خلاف مصلحت جان کر) قلم نہ اٹھایا ہوگا۔ حالاں کہ آج بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی، اس پہلو کا سامنے لانا، کم سے کم راقم کی نظر میں جتنا زیادہ مناسب بلکہ ضروری ہے اتنا کسی اور پہلو کا نہیں ہے۔ اسی وجہ سے راقم نے آں محترم کی زندگی کا یہی اہم پہلو (بلکہ کہنا چاہیے اہم کارنامہ) یعنی فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حکیم الاسلام کا حصہ پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (وبیداللہ التوفیق)

اس عنوان وموضوع کا قدرتی تقاضہ ہے کہ پہلے ''دارالعلوم کا فکر'' (جو مجموعہ ہے ایک خاص مسلک مشرب اور منہج کا) معلوم ہو، اس کے بعد ہی حفاظت و بقاء، نیز اشاعت وصیانت کا تذکرہ برمحل اور قابل اعتناء ہوگا۔

یہاں یہ حقیقت ظاہر کئے بغیر نہیں گذرا جا سکتا کہ فکر دارالعلوم کا یکجا تفصیلی اور جامع تعارف، تحریری شکل میں آج ہمیں اسی کی زبان وقلم سے معلوم ہوسکتا ہے جس کی ساری زندگی اسی فکر کی ترجمانی کرتے بلکہ اس کی فکر میں گھلتے گزری، یعنی وہی شخصیت جو آج کے تذکرہ کا موضوع ہے۔ (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کاملۃ)

اسی تحریری فکر کا درجۂ اعتبار بڑھانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہونی چاہئے کہ ''مسلک دارالعلوم'' کے عنوان سے یہ دستاویز اس زمانے میں ہی منظر عام پر آ چکی تھی جب کہ ''دارالعلوم'' کے ارباب بست وکشاد، میں اکثریت ایسے حضرات کی تھی جو مسلک دارالعلوم (یا فکر دارالعلوم [۱]) میں دستور کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان ومتعلقین دارالعلوم کا فرض ہوگا۔ کسی ملازم یا طالب علم کو بھی اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کے لئے ضرر رساں ہو۔ دستور کی اس بنیادی دفعہ کو سامنے رکھ کر تمام منتسبین دارالعلوم بالخصوص اس کے ارکان اور ملازمین کو اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ واقعتاً کیا وہ اس دفعہ پر عمل پیراں ہیں) سے نہ صرف پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ تنہا اسی کو اپنی دنیا وآخرت

[۱] جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ''فکر دارالعلوم'' تین چیزوں (مسلک، مشرب، منہج) سے عبارت ہے، تفصیل آگے آرہی ہے، مگر زیادہ تر مشہور اور زبان زد لفظ ''مسلک دارالعلوم'' ہوگیا ہے (اس کی حیثیت وہی ہے جسے علمی زبان میں ''تسمية الكل باسم الجزء الاهم'' کہتے ہیں) دستورِ اساسی کی رو سے بھی دارالعلوم کے ہر متعلق بالخصوص تمام ارکان کے لیے اس کی پیروی کی حفاظت ضروری تھی، جیسا کہ تاریخ دارالعلوم (ص ۲۳۴، ج:۱) میں درج ہے۔

سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں اس وقت ایسے تو بہت کم تھے جو اس فکر سے ناواقف یا نامانوس ہوں یا اس پر پورا انشراح نہ ہونے کی وجہ سے فلاح ذات وقوم کے لئے دوسری راہوں اور فکروں کی تلاش وتجربات میں مشغولیت کو یا اس فکر سے متوحش ہونے کی بنا پر اس کی مخالفت کو حق ودیانت کا تقاضہ سمجھتے رہے ہوں اور ایسا تو شاید ایک بھی نہ تھا یا اس کی جرأت نہیں کرسکتا تھا جو کہ محض دنیاوی مصالح کی خاطر حق سے چشم پوشی یا حق دشمنی پر کمر بستہ ہوجانے میں بھی تأمل نہ کرے۔

دارالعلوم کا مسلک

حاصل کلام یہ کہ ذیل میں ''مسلک دارالعلوم'' کا جو تفصیلی تعارف کرایا جارہا ہے وہ تنہا کسی ایک ذات کی جودۃ طبع یا تراوشِ قلم نہیں ہے، بلکہ اس پر اپنے زمانہ کے مسلّم ''دیوبندیوں'' کی مہر تصدیق خواہ وہ سکوتی ہی ہو ثبت ہے۔ اس کے بعد ''مسلک دارالعلوم'' نامی رسالہ کے مصنف کے الفاظ میں اس کا تعارف سنئے:

علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت، مسلکاً اہل سنت والجماعۃ ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت، اجماع وقیاس پر قائم ہے۔ (ایک دوسری جگہ مصنف نے خود ہی ایسی بلیغ تشریح کی ہے کہ پڑھ کر بے ساختہ جزاہ اللہ نکلا، فرماتے ہیں) پہلی دو حجتیں تشریعی ہیں، جس سے شریعت بنتی ہے اور آخری دو حجتیں تفریعی ہیں جن سے شریعت کھلتی ہے (ص ۲۳۴ ج ۱، ایضاً) اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل روایت کو اور آثار سلف کو حاصل ہے، اس کے یہاں کتب وسنت کی مرادات مخفی قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اقوال سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں رہ کر، نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہیں۔ (ص ۴۲۴) اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات، رواجی طریقوں،

اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ (ص ۴۲۵) مزید فرماتے ہیں، دارالعلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تصوف (یعنی احسانی صفت جس کا اصطلاحی نام تصوف ہے) حقیقت اور معرفت یعنی جملہ دینی علوم اور مقامات کے مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ ایسے جامع انداز میں پیش کیا کہ تمام مسلکی طبقات کے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہوگئی۔ (تاریخ ص ۲۸، ج ۱)

''دارالعلوم کا دستور اساسی'' میں (ص ۶ پر) دارالعلوم کے مسلک ومشرب، کی مختصر تشریح اس طرح کی گئی ہے:

> دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت، حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں (حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ بانیٔ دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ) کے مشرب کے موافق ہوگا۔ (تاریخ ص ۴۳۱، ج ۱)

مشرب: اس سے پہلے اور بھی اوپر کی سطروں میں دستور کے حوالے سے دارالعلوم کے مسلک کے ساتھ مشرب کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے۔

مشرب سے مراد جیسا کہ دستور کی عبارت میں گذرا ان دونوں (حضرت نانوتویؒ وحضرت گنگوہیؒ) کا خاص زاہدانہ، متوکلانہ، متصوفانہ یعنی احسانی رنگ ہے جیسے صاحب ''مسلک دارالعلوم'' نے دوسری جگہ ''مشرباً صوفی'' سے تعبیر کیا ہے، ایک موقعہ پر اس کی تفصیل یہ کی ہے...... سلاسل علمیہ اور سلاسل فقہیہ کے ساتھ، سلاسل صوفیہ واحسانی نسبت کو بھی جمع کر دیا ہے، ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے حضرت جھنجھانویؒ (خلیفۂ مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ) کے

خلیفۂ اعظم حاجی امداد اللہ تھے...... (جس کی وجہ سے) سند حدیث کے ساتھ سند خلافت باطنی...... نقشبندیت کی لائن سے مجددی (یعنی) پیرویٔ سنت اور سید احمد شہیدؒ کے (جذبۂ) اعلاء کلمۃ اللہ کی روح بھی راسخ رہی...... اس (مشرب) میں ہر (دینی) فتنہ کی مدافعت بھی داخل ہے، خواہ وہ (فتنہ) نقل وروایت کی راہ سے آیا ہو، یا بے لگام عقلیت (نیچریت) کی راہ سے (اس فتنہ نے) خواہ شرک وبدعت کا روپ دھارا ہو یا الحاد و بے دینی اور آزاد خیالی کا...... (ان سب باتوں کے ساتھ دارالعلوم کا مشن) تمام مسلک حقہ (بالخصوص ہندوستان کے) اہل مسالک کو باہم جوڑنا ہے۔

(ماخوذ از تاریخ دارالعلوم ص ۳۵ /۳۶ /۳۷، ج ۱۔ مرتبہ سید محبوب رضوی مرحوم)

اوپر کی تفصیلات سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوجاتی ہے کہ ''دیوبندیت'' کوئی نیا، مذہب، یا فرقہ نہیں ہے، بلکہ وہ مسلک اہل سنت والجماعت کا ایک جامع مرقع ہے، چنانچہ شاعر مشرق ڈاکٹر سید محمد اقبال مرحوم کہ جن کی دینی حمیت اور وسعت نظر نیز محبت رسول معلوم ومعروف ہے، سے جب کسی شخص نے اس بارے میں سوال کیا تو فرمایا (دیوبندیت) نہ مذہب ہے نہ فرقہ بلکہ ہر معقول دیندار کا نام دیوبندی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل، یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقی دیوبندی کی پہچان، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ جس میں علمی وقار، استغناء فروتنی...... ایثار وزہد (صفات میں جمع ہوتی ہیں لیکن) کبر ونخوت (نہیں ہوتی) اور نہ ذلت (کہ عزت نفس پامال کرلیں) جہاں یہ علم واخلاص کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے بلند ہوجاتے ہیں وہیں تواضع کی وجہ سے عوام میں ملے بھی رہتے ہیں...... مجاہدہ مراقبہ کی وجہ سے خلوت پسند ہونے کے ساتھ مجاہدانہ وغازیانہ...... نیز قومی خدمات کے جذبات سے سرشار بھی ہوتے ہیں۔ (ان کے نزدیک)

محدث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنا، یا فقیہ ہونے کے معنی محدث بیزار ہونے، یا صوفی ہونے کا مطلب متکلم دشمنی، یا علم کلام میں مہارت کا تقاضہ تصوف بیزاری نہیں، بنابریں دینی شعبوں کے تمام ارباب فضل وکمال (کیا محدثین متکلمین، کیا فقہاوصوفیاء، کیااصولیین ومنطقیین اور کیاامراء وخلفاء) ان کے یہاں سب واجب الاحترام ہیں، لیکن ان تمام شعبوں میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت کے نزدیک تعلیم علوم نبوت کو حاصل ہے۔ (تاریخ ص۸، ۴۲۵، باختصار)

دارالعلوم کے مسلک ومشرب کی قابل لحاظ حد تک تفصیلات بیان میں آجانے کے بعد مناسب ہوگا کہ ادارہ کے مقدس بانیؒ نے، اس کے چلانے کے غرض سے جو اصول مقرر فرمائے اور تحریر کر دیئے تھے، ان کا بھی مختصراً تذکرہ آجائے اس کو یہاں منہج کا نام دیا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کے مقرر کردہ ان اصول ہشتگانہ سے اب شاید ہی کوئی وابستگانِ دارالعلوم میں سے ناواقف ہوگا جو موصوف نے بطور ''اصول موضوعۃ'' یا ''دستورالعمل'' کے مقرر فرمائے تھے، غالباً اسی لیے ان کے زبانی اظہار وبیان پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ تحریری شکل میں منضبط فرما کر گویا انھیں رجسٹرڈ کر دیا تھا، عبارت کا طرز صاف بتارہا ہے کہ ان کے اصول کے اندر دارالعلوم کے چلانے کا دائمی طریقِ کار بیان کیا گیا ہے، ورنہ ان سے انحراف ہونے کی شکل میں، زوال کی پیشین گوئی نہ ہوتی (حالیہ واقعات نے تو عملی طور پر ان کے دائمی بلکہ الہامی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا) یہاں ان تمام اصول کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لئے بس چند کے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے جن چند اصولوں کے ملحوظ نہ رکھنے پر اس میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے وہ پوری ہوتی صاف نظر آرہی ہے اس قبیل کا ایک اصول یہ ہے۔

مشیران مدرسہ (نہ کہ حاکمان مدرسہ) کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ
کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس
کی نوبت آئیگی کہ اہل شوریٰ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے
موافق ہونا ناگوار ہوتو پھر اس مدرسہ کی بنیاد ہل جائے گی۔

غور کیا جائے کیا حالیہ فتنہ میں رونما ہونے والے افسوسناک بلکہ شرمناک واقعات کی ایک بڑی اہم وجہ یہی نہیں ہوئی کہ بعض مشیران مدرسہ (نہ کہ حاکمان) نے اپنی بات کی پچ کی اور اپنی مخالفت رائے اور انھیں اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہوا۔

ان اصول ہشتگانہ میں ایک یہ ہے:

یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب اور مثل
علماء روزگار کے خودبیں اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ
جب اس کی نوبت آئیگی تو پھر مدرسہ کی خیر نہیں۔

کیا یہ مقام حیرت بلکہ عبرت نہیں! کہ حالیہ ہنگامہ کے دوران بعض مدرسین خود بینی اور خودسری کی آخری حدتک پہنچ کر کیا دوسروں، بلکہ خود مہتمم تک کے درپے توہین بلکہ درپے آزار نہیں ہو گئے تھے؟ تو پھر ایسی صورت میں کیا مدرسہ کے خیر کی امید کی جاسکتی ہے؟

ہم یہاں ان اصولوں میں سے صرف ایک کے پیش کرنے کی اور اجازت چاہیں گے جو یہ ہے۔

اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں تب تک یہ
مدرسہ انشاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی
یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر، یا کارخانۂ تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ،
تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا
رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائیگی، کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائیگا۔

جیسا کہ اوپر مسلک دارالعلوم کے بیان کے دوران گذرا، ان اصولِ ہشتگانہ سمیت، مسلک دارالعلوم کی پیروی اور حفاظت، دستور اساسی کی رو سے تمام ارکان و متعلقین دارالعلوم پر فرض قرار دی گئی ہے تو کیا واقعتاً، ارکانِ دارالعلوم اور اس کے متعلقین نے یہ فرض ادا کیا؟ سب کو بالخصوص ارکان، کو کہ انھوں نے سب سے زیادہ دستور کا ذکر کیا ہے، اپنا بھی محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ ان پر ہے (فکر دارالعلوم کا بیان ہوجانے کے بعد آیئے) دیکھیں کہ اس ذاتِ گرامی نے دستور و مسلک دارالعلوم (مع اصولِ ثمانیہ) کی رعایت وحفاظت کس درجہ کی؟ کہ جس پر دستور کی خلاف ورزی کا بہت زوردار آواز میں الزام لگایا گیا؟

مرحوم کے فکر دارالعلوم کی اشاعت وحفاظت میں حصہ کے جائزہ سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہورہا ہے کہ دیکھا جائے کہ خود موصوف اس فکر سے کتنے ہم آہنگ تھے اور کس درجہ اس کے مثالی نمونہ بننے کے لائق؟ کہ اس کے بغیر سچ پوچھئے تو نہ ترجمانی کا حق حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی عمل کی بات میں تاثیر ہوتی، اور نہ ہوسکتی ہے کیوں کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ، کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَاللّٰہ ... الخ کا تقاضا ہے کہ ایسی صورت میں خداوند تعالیٰ کی رضا کے بجائے شدید ناراضگی حصہ میں آئے تو پھر کامیابی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

اس فکر کے پہلے جزو (مسلک) میں سب سے اہم مقام (اس لئے سب سے زیادہ توجہ کا مستحق بھی) علوم نبوت کا اور ان کی تعلیم و تعلّم کا بتایا گیا ہے چنانچہ اس بارے میں موافق ومخالف سب ہی متفق ہیں کہ مرحوم کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ علم کے بعض شعبوں میں، ملک کے خواہ دوسرے علماء امتیاز رکھتے ہوں لیکن مجموعی طور پر، مطالعہ کے تنوع، وسعت اور عمق میں موصوف کا پایہ، اگر سب سے بلند نہیں تو کم سے کم یہ کہ بہت بلند تھا، اور مشکل علمی مضامین، بالخصوص

نصوص متعارضہ اور سلف کے اقوال مختلفہ میں تطبیق دے کر اور ان کی مراد متعین کر کے واضح عام فہم دل نشین اور شیریں انداز سے پیش کرنے کے کمال میں اب کوئی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بعد ان کا ثانی نہ تھا۔

موصوف کے تبحر علمی اور وسعت نظر کی چھاپ، عوام ہی نہیں، علماء تک پر، کس درجہ کی تھی؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے شاید یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آج نہیں بلکہ پچیس، تیس سال قبل بھی، جب کہ آج کل کا جیسا قحط الرجال بھی نہ تھا، اہل علم تک یہ کہتے سنے گئے کہ ہندوستان کے سارے علماء کا مجموعی علم ایک طرف اور تنہا مولانا قاری صاحبؒ کا علم ایک طرف، ظاہر ہے کہ کم سے کم اس وقت یہ قول مبالغہ سے خالی نہ تھا لیکن اس سے بہر حال اتنا تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ اہل علم کے نزدیک بھی ممدوح علمی طور پر فرومایہ نہ تھے بلکہ ممتاز ترین علماء کی صف میں شامل سمجھے جاتے تھے۔

موصوف کے ذوق علمی کے تمام دوسرے مذاقوں پر غالب ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دارالعلوم کے اہتمام جیسے اعلیٰ اعزاز واکرام، بلکہ ایک درجہ میں راحت واحترام کے منصب پر فائز ہونے اور تعلیمی شعبہ سے منتقل ہونے کیلئے موصوف طبعاً تیار نہ تھے، مگر اس فکر کے ہی ایک تقاضہ، اکابر کے حکم کی تعمیل اور ان کے احترام سے بادلِ ناخواستہ مہتمم بننا گوارا کیا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تقریباً دس بارہ سال قبل، مجلس شوریٰ کے بہت سے ممتاز اور بااثر ارکان نے حضرت مہتمم صاحب سے ان کے خلف الرشید کو نائب مہتمم بنانے کے لئے جب اجازت چاہی تو موصوف نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ”خاندانِ قاسمی کا امتیاز علم ہے، نظم نہیں۔“

یہ واقعہ حالیہ حادثات کے موجب کے طور پر جس واقعہ کو بہت نمایاں کیا جاتا

ہے اس پر روشنی ڈالنے کے لئے بھی ، اہل نظر کے واسطے کافی ہے کہ اگر واقعتاً موصوف نے حالیہ زمانہ میں ایسی خواہش کا اظہار کیا تھا، تو وہ کسی اور جذبہ سے نہیں بلکہ دارالعلوم ہی کی خیرخواہی کے تقاضہ سے کیا ہوگا (کہ ان کی مثال اس بارے میں خود راہنمائی کرتی ہے اور پھر یہ کہ موصوف کی پوری زندگی دارالعلوم کی سچی خیرخواہی کے جذبات پر شاہد عدل ہے۔ مگر ان پر الزام لگانے والوں کی زندگی کا تو شاید بہت محدود عرصہ بھی اس کی شہادت میں پیش کرنا مشکل ہوگا)۔

موصوف کے علمی مقام پر سب سے بڑھ کر شہادات، وہ بیانات بھی ہیں جو ان کے حادثۂ وفات پر زبانی یا تحریری، تمام قابل ذکر علماء اور دوسرے طبقات کے آئے، ان میں موافق ومخالف سب ہی نے دوسری خوبیوں کے ساتھ علمی بلندی کا بھی اعتراف واظہار کیا ہے (سوائے ایک بزرگ کے، کہ انھیں صرف مرحوم کا علمی امتیاز تجوید وقرأت ہی میں نظر آیا) بلکہ ایک بہت قابل احترام بزرگ جو نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنی نسبت کے لحاظ سے بھی تمام اہل حق کے نزدیک واجب الاحترام سمجھے جاتے ہیں، نے تو یہ تک فرمایا (اور پھر شائع بھی کرایا) **عجزت النساء ان یلدن مثل طیب** (اب طیب کا ثانی پیدا کرنے میں عورتیں عاجز ہیں) اس سے بھی زیادہ قوی تر دلیل موصوف کے ذوقِ علمی کی یہ ہے کہ اہتمام کے متنوع اور تھکا دینے والے بے پناہ مشاغل، نیز دیگر میدانوں میں سرگرم عمل رہنے کے باوجود، ساری عمر موصوف نے علم ومطالعہ سے اپنا رشتہ قائم رکھا، اسی تعلق کا یہ اثر تھا کہ فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ جیسے جلیل القدر محدث کی وفات کے بعد اور اس کے علاوہ بھی دیگر مواقع پر دارالعلوم جیسی ممتاز درسگاہ میں صحیح بخاری جیسی ادق اور اعلیٰ کتاب کا، دورۂ حدیث جیسی اہم جماعت کے طلبہ کو (جس میں ایک خاصی تعداد ماہر اساتذہ تک کی شامل ہوا کرتی تھی، اور پھر بعض طلبہ بھی

ایسے جیدالاستعداد، کثیرالمطالعہ اور وسیع النظر ہوتے تھے کہ ہندوستان کے بہت سے مدارس کے اعلیٰ مدرسین اور ''شیخ الحدیث'' کی مسندیں سنبھالنے والے بھی ان کی برابری بمشکل کر سکتے تھے) نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔

فکر دارالعلوم کے علمی تقاضہ کے علاوہ دیگر اوصاف و تقاضے مثلاً نصاب فی الدین، دینی حمیت، اسلاف کی عظمت، فرق باطلہ کا حکیمانہ رد، تحمل، حقیقی تصوف، (تزکیہ واحسان) مناسبت، تواضع، استغناء وغیرہ، اوصاف تو موصوف میں اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی انکار کرنے کی جرأت، آخرت میں جوابدہی کا خطرہ مول لئے بغیر نہیں کرسکتا ہے۔ اس وجہ سے ان کے مذکورہ اوصاف میں کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں، البتہ صرف تین (تواضع، تصوف اور فرقِ باطلہ کا حکیمانہ رد) کے بارے میں اتنا کہے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہو رہا ہے کہ کم سے کم ادھر ۳۰/۴۰ رسال کے اندر، ان کے جیسے پایہ کے کسی شخص کے یہاں، ان کی جیسی تواضع کا تجربہ ومشاہدہ، کسی کو مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا۔ کہ وہ اپنے چھوٹے ہی سے نہیں، چھوٹوں کے چھوٹے سے بھی اس طرح پیش آتے تھے کہ برابر والے بھی کم ہی پیش آتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی جیسی، کم سے کم راقم سطور کو تو اور کہیں تواضع نظر نہیں آئی۔ (حالانکہ سیکڑوں چھوٹے بڑے علماء سے ملنا جلنا ہوا ہے)۔

اسی طبعی تواضع کا یہ اثر تھا کہ ان کے ایک معاصر نے جو عمر میں بھی ان سے کم ہیں، جب ان سے معافی طلب کی تو ان کی متواضعانہ طبیعت پر سخت بار ہوا اور اس کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جو آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں، موصوف نے انہیں جواب دیا: آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی کبھی خطاوار نہیں سمجھا کہ ان کی زبان پر معافی کی بات آئے۔

تزکیہ واحسان کی صفت میں امتیاز کی سند کے لئے یہی کافی ہے کہ موصوف،

اپنی جماعت اور اپنے وقت کے سب سے متقی عالم حضرت شیخ الہندؒ کے دست گرفتہ، اور اپنے عصر کے سب سے بڑے مصلح اور بے مثال مربی حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز تھے۔

فرق باطلہ کی حکیمانہ تردید میں مرحوم کے حکیمانہ اسلوب کی شہادت کے لئے برصغیر کے مشہور مسلّم صحافی اور مبصر، ماہرؔ القادری صاحب مرحوم کا وہ تبصرہ کافی ہے، جس میں ماہرؔ صاحب نے اپنے پشتینی مسلک، کٹر بریلوی سے ہٹ کر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہی کی تقریر دل پذیر کے اثر سے صحیح العقیدہ بن جانے کی تفصیل اور دیگر بہت سی مفید باتیں، اپنے شہرۂ آفاق ماہنامہ ''فاران'' کراچی میں تحریر فرمائی تھیں (جو بعد میں کتابی شکل کے اندر بھی شائع اور مقبول ہوا) اس وصف کی سب سے نمایاں مثال، اور جیتی جاگتی تصویر بمبئی شہر ہے کہ جہاں موصوف کے حکیمانہ خطابات ہی کے ذریعہ، ابتداءً فضا بدلی، اس کے بعد ہی اہل حق کو وہاں پاؤں ٹکانے بلکہ اپنی بات کہنے اور باطمینان سنانے کے لئے زمین مل سکی (ورنہ اس سے پہلی ایسی جرأت ''گستاخی'' کے زمرہ میں آتی اور سخت سزا کا مستوجب بنا دیتی تھی) یہی وجہ ہے کہ اہل حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ باشعور لوگ ان ہی کے دست گرفتہ پائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی آں محترمؒ نے ''فکر دارالعلوم'' کی اشاعت وحفاظت کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے؟ آئندہ سطروں میں ان میں سے کچھ کا ذکر کیا جارہا ہے بلکہ کچھ......ہی کا کیا جاسکتا ہے۔ سب کا ذکر تو کسی مقالہ کا نہیں کتاب کا موضوع ہے۔

اوپر کی سطروں سے نیز دوسرے واقعات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ یہ فکر، موصوف کے جسم وروح میں اس طرح پیوستہ ہوکر رچ بس گئی تھی کہ ان کی ذات ہی ''مجسم ،فکر قاسمی'' اور ''سراپا دارالعلوم'' بن گئی تھی۔ ان کی وفات پر متعدد

اہل علم اور اصحاب فکر و دانش نے جو یہ لکھا ہے کہ ”انھوں نے اپنی ذات کو دارالعلوم میں اس طرح گم کر دیا تھا کہ ایک کا تصوّر دوسرے کے بغیر ممکن نہ رہا تھا“ (مفہوم) اس میں نہ غلط بیانی ہے نہ مبالغہ، بلکہ حقیقت کی صحیح صحیح ترجمانی ہے، کیوں کہ وہ جس جگہ گئے، اور دنیا کا کون سا اہم حصہ ہے جہاں وہ نہیں گئے؟ کیا امریکہ و یورپ، کیا افریقہ وایشیا، کیا عرب اور کیا عجم، جہاں وہ گئے، فکر دارالعلوم کے ساتھ پہنچے بلکہ ان کی تنہا ذات گرامی کی بدولت، مدرسۂ دیوبند مدرسہ ”دارالعلوم“ پھر عظیم جامعہ بنا۔ اور شہروں سے لے کر قصبات و دیہات میں دارالعلوم کی صدا ان کی ہم آواز بن کر اس طرح پہنچی کہ وہاں کے حساس دلوں کی دھڑکن اور ان کی اپنی آواز بن گئی۔ اور ان کی آواز کی طرح ذات بھی دارالعلوم میں اس طور پر سما گئی تھی کہ ان کی ذاتی شہرت، دارالعلوم کی شہرت، اور ان کا اپنا نفع ونقصان، دارالعلوم کا نفع نقصان بن گیا۔ اسی لیے ان کیلئے ”مہتمم صاحب“ کا لفظ وصف نہیں ان کا ذاتی نام بن گیا۔

اور ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہوتا تو حیرت ہوتی، کیوں کہ موصوف کی تو آنکھیں ہی اس فکر کے آغوش میں کھلیں اور اسی فکر کے اعلیٰ ترین نمونوں ”اور مثالی پیکروں“ کے سائے میں وہ پروان چڑھے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حکیم الاسلامؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وہ حکیمانہ الفاظ مہتمم صاحب کی ذات میں، جسم و قالب بن کر نظر آنے لگتے ہیں، جو شاہ صاحب نے مشہور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ”الأئمة من قریش“ کی تشریح کرتے ہوئے زیب قرطاس کئے ہیں، فرمایا ہے:

ان یجعل الخلفاء من بعده اهل بلده و عشیرته الذین تشوع و اعلیٰ تلک العادات و السنن و لیس التکحل کالکحل و یکون الحمیة الدینیة فیهم مقرونة بالحمیة النسبیة ویکون علو امرهم و بناهة شانهم علواً

لامر صاحب الملة۔ (حجة الله البالغة: ص: ۱۱۹، ج: ۱)

ترجمہ: جانشینوں کو ان ہی کے خاندان اور ان ہی کے شہر کا ہونا چاہئے کیونکہ اسی ماحول میں چلنے اور پڑھنے کی وجہ سے ان لوگوں کے اندر (مطلوبہ) عادات اور طریقے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتے ہیں (اس کے بعد بہت بلیغ تمثیل کے ذریعہ فرق واضح کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے) جس کی آنکھ قدرتی اور پیدائشی طور پر سرمگیں ہو اس کا وہ شخص مقابلہ کہاں کر سکتا ہے کہ جس نے صرف سرمہ لگا لیا ہو اور یہ بات بھی ہے کہ (اسی خاندان کے جانشین کی) حمیت دینی اور حمیت نسبی دونوں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور (اسی لئے) اس کی ذاتی بڑائی بھی دین کی بڑائی سے مربوط ہو جاتی ہے۔

اشارۂ نبویؐ اور اسی سے پیدا شدہ حکمت ولی اللّٰہی کا ہی غالباً پرتو تھا کہ دارالعلوم کی فکر کے حقیقی نمونہ اور اس کے سچے خیر خواہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو اکابر نے اصرار کے ساتھ منصب اہتمام پر فائز کیا تھا۔ چنانچہ جو تجویز بابت تقرری منظور ہوئی اس میں یہ بھی صراحت تھی کہ مولانا موصوف نوجوان صالح صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسل سچی ودلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ (تاریخ ص ۲۷۹، ج ۱)

اور یہی وہ واحد ترجیحی سبب تھا جس کی بنا پر حضرت الاستاذ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز اس وقت بے چین ہو گئے تھے جب حکیم الاسلام بعض مصالح کی وجہ سے (جواب راز نہیں رہے ہیں) ایک نئے وجود میں آنے والے مسلم ملک چلے گئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے جب تک مہتمم صاحب کو واپس بلا کر مسند اہتمام پر جلوہ افروز نہیں دیکھ لیا اس وقت تک آں مخدومؒ کا خواب وخور گویا حرام ہو گیا تھا۔ (نور اللہ مرقدہما وطاب ثراہما)

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ ''تحویل قبلہ'' [۱] کی حالیہ مہم کے دوران جن لوگوں نے اپنے ذاتی غور وفکر کے نتیجے میں تبدیلی کو ضروری سمجھا اور اسی لئے اپنا پورا زور سنانِ قلم یا لسانِ دہن استعمال کر کے صرف کیا، اس لئے اس پر بھی تعجب نہ ہونا چاہئے کہ اس شورش کے درمیان (حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے دادا) حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کو بانئ دارالعلوم دیوبند ہونے کی حیثیت سے چیلنج کیا گیا بلکہ ان کی مقدس ذات (نیز ان کے بلند مرتبہ صاحبزادہ، حافظ محمد احمد صاحبؒ) پر تنقیص کی حد تک پہنچنے والی تنقیدوں میں بھی ذرا تأمل یا باک نہیں ہوا، مزید برآں کہ بانئ دارالعلوم کے مقرّر کردہ اصول ہشتگانہ کو آج کے دور کے لئے نہ صرف ناکافی بتایا گیا بلکہ ان کا مذاق تک اڑایا گیا۔ (فالی اللہ المشتکیٰ)

یہاں مہتمم صاحب کے فکر دارالعلوم کی حفاظت کے لئے اہتمام کا پتہ دینے والے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہورہا ہے لیکن واقعہ سننے سے پہلے اصول ہشتگانہ میں سے وہ اصل ذہن میں تازہ کر لیجئے جس کے اندر کارخانۂ تجارت، جیسی مستقل آمدنی کی سبیل کو امدادِ غیبی موقوف ہونے کا سبب قرار دیتے ہوئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

[۱] راقم سطور نے دارالعلوم سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ہٹائے جانے کی مہم کو ''تحویل قبلہ'' کا نام طنزاً نہیں دیا ہے بلکہ واقعہ یہی ہے اور جو لوگ بصیرت رکھتے ہیں وہ پہلے ہی سمجھ رہے تھے، بلکہ کہہ رہے تھے کہ ان کا ہٹنا سمت (رخ) بدلنے کا سبب بن جائے گا، چنانچہ بعد میں بہت سے لوگ بھی یہی کہتے سنے گئے جو پہلے یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے (اور تبدیلی کی مہم میں حصہ بھی لے رہے تھے) اگرچہ جزوئ تبدیلی سمت کے آثار پہلے ہی سے رونما ہونے لگے تھے مگر بہرحال ایک قطب نما موجود تھا، جس کی موجودگی سے رخ ٹھیک کر لینے کا امکان ضرور تھا۔

اجلاس صد سالہ کے موقعہ پر دارالعلوم کی ہمہ گیر خدمات (اور مہتمم صاحبؒ کے ذریعہ ہونے والے عمومی طور پر اس کے تعارف اور) خداداد مقبولیت کی وجہ سے سارے عالم، بالخصوص ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آکر جمع ہونے والے انسانوں کا سمندر کہ جس کی نظیر میدان عرفات کے علاوہ اور کہیں نہیں دیکھی جاتی بلکہ نہیں دیکھی جاسکتی۔ جب دیوبند میں ٹھاٹھیں مارنے لگا، تو قدرتی بات تھی کہ دارالعلوم کے چندہ میں غیر معمولی رقم جمع ہوئی، اس جمع شدہ رقم کے بارے میں ''بعض اہل الرائے'' نے تجویز کیا کہ اسے یونٹ ٹرسٹ میں جمع کردیا جائے (جن کو وہ سمجھتے تھے کہ تجارتی ادارہ ہے اور وہاں جمع شدہ رقم پر تجارتی نفع بھی ملتا ہے جو سود کے شائبہ سے پاک ہوتا ہے) لیکن حضرت مہتمم صاحبؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور (فقہی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے) فرمایا کہ دارالعلوم کا موضوع تجارت نہیں، تعلیم ہے، اس لئے بھی وہاں رقم جمع کرنا مناسب نہیں، واقعہ نقل کرتے ہوئے راوی آبدیدہ سے ہوکر کہنے لگے بھلا اب ان نزاکتوں کو کون ملحوظ رکھے گا؟ (اس واقعہ کے راوی بھی وہی ثقہ قاسمی فاضل ہیں جن کے حوالہ سے اوپر بھی ایک واقعہ ذکر ہو چکا ہے) یہ واقعہ جو ہر طرح دارالعلوم اور اس کے مسلک کے محافظ مہتمم کے شایان شان تھا لیکن ان کے کرم فرماؤں کی نظر میں کیا بن گیا؟ اسے جاننے کے لئے دل پر جبر کرکے، یہ چند سطریں آپ بھی پڑھ لیجئے، اس وقت بھی بعض ارکان کو یہ اندیشہ تھا کہ مہتمم صاحبؒ کے بعض متعلقین اس تجویز کو اپنے غلط ارادوں کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر چلنے نہیں دیں گے اور مہتمم صاحبؒ کو اس کے لئے استعمال کریں گے۔ افسوس یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور نہ صرف یہ کہ اس تجویز کی تکمیل کی گئی بلکہ اس عدمِ تعمیل کو مقدس شرعی لباس پہنایا گیا، اس موقعہ پر امام شافعیؒ کا یہ مشہور شعر نقل کرنا بھی شاید بے محل نہ ہوگا ؎

عیـن الرضا عین کل عیب کلیلـۃ
کما ان عن السخط تبدی المساویا

اہل نظر کے لئے تنہا یہ مثال آئندہ کے دارالعلوم کا رخ اور قبلہ دریافت کرنے کے لئے کافی ہے!

اس لئے یہ سوال قدرتی ہے کہ مہتمم صاحبؒ کے بعد دارالعلوم کی ظاہری شان و شوکت باقی رہنے بلکہ بڑھ جانے کے باوجود کیا اس کی معنویت بھی اس درجہ پر قائم رہ سکے گی؟ یہ بات اللہ عالم الغیب والسرائر کے علاوہ اور کون جانتا یا جان سکتا ہے؟

یہی وہ سوال ہے کہ جو خیرخواہوں کو فکرمند بنائے رکھتا ہے۔ اگرچہ کارساز حقیقی نے جس طرح اس کے بانیوں اور اوّلین معماروں کے اخلاص کی برکت سے اب تک نازک سے نازک تر مواقع پر اس کی حفاظت فرمائی ہے اسی کے فضل وکرم سے امید ہے کہ آئندہ بھی حفاظت فرمائے گا مگر ڈر اس بات سے لگتا ہے کہ حالیہ فتنہ کے درمیان دوسری کوتاہیوں کے علاوہ خداوند تعالیٰ کی ایک بہت عظیم نعمت کی بڑی ناقدری ہوئی [۱] اور کفران نعمت ہوا ہے۔

[۱] اور کس درجہ ناقدری ہوئی؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے دل پر پتھر رکھ کر یہ بھی سن لیجئے کہ جس زمانہ میں مہتمم صاحب کے خلاف الزام تراشی کی مہم زوروں پر چل رہی تھی اور اس کے ذریعہ غلط فہمیاں پھیلانے میں فی الجملہ کامیابی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس زمانہ میں الزام تراشیوں کے گروہ کے چھوٹی سطح کے لوگ برملا کہتے سنے گئے کہ ہم نے ایسا کر دیا ہے کہ اب حکیم الاسلام کی حیثیت سے تو ان کا انتقال ہوگا نہیں۔ (مطلب یہ تھا کہ غلط فہمیوں کے پھیل جانے کے بعد ان کی موت پر آنسو بہانے کے بجائے خوشیاں منائی جائیں گی) لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ سارے عالم اسلام نے کس طرح ان کی جدائی پر خون کے آنسو بہائے (شاید اتنے پہلے نہ بہائے جاتے) بلکہ وہ لوگ بھی رونے پر مجبور ہوئے جنھوں نے زندگی میں انہیں ان کا دل دکھا کر رلایا تھا اور جنازہ میں اتنا ہجوم ہوا کہ چشم فلک نے دیوبند میں کسی کے جنازہ کے ساتھ نہ دیکھا تھا حالانکہ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر آسمان علم وتقویٰ کے آفتاب و ماہتاب آسودۂ خواب ہیں۔

اوپر دارالعلوم کے مسلک ومشرب کے تذکرہ میں ذکر آیا کہ اس کے مقاصد میں ہر دینی فتنہ کی مدافعت بھی شامل ہے، اس بارے میں مہتمم صاحبؒ کے بس ایک روشن بلکہ عالم آشکارا کارنامے کا تذکرہ کافی ہوگا۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کے عائلی قوانین نکاح، طلاق، میراث وغیرہ جنھیں ''مسلم پرسنل لا'' کہا جاتا ہے، کے خلاف کچھ نام نہاد مسلمانوں اور روشن خیال سیاستدانوں کی طرف سے حکومت کی ایماء پر زبردست مہم چلائی گئی اور اس کا پورا خطرہ پیدا ہوگیا کہ شریعت اسلامیہ کے جن چند قوانین پر عمل کرنے کا مسلمانوں کو ہندوستانی دستور کی روح سے حق باقی رہ گیا بس وہ بھی اب چھینا جانے والا ہے اور پارلیمنٹری جمہوریت، جو دراصل اکثریت کا نام ہے، کی لاٹھی سے اس کے کچلنے کی تیاریاں آخری مراحل پر ہیں تو سب سے پہلے اسی دارالعلوم کے جس کے قیام اور وجود کا اصل باعث ہی دین وشریعت کی حفاظت وبقاء ہے، کے سربراہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ بے چین ہوگئے اور پھر بہت سی حکیمانہ تدابیر اختیار کیں جس کا ثمرہ بالآخر تمام ہندی مسلمانوں کے واحد متفقہ پلیٹ فارم ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی شکل میں برآمد ہوا اور ایسے مختلف افکار ونظریات رکھنے والے افراد پر مشتمل بورڈ کی صدارت کے لئے موصوف سے زیادہ موزوں تر اور کوئی شخصیت، پورے ہندوستان میں نہ مل سکی، چنانچہ وہی از روز اوّل تا آخر حیات، اس کے صدر رہے۔ (مرحوم کی اس خصوصیت کا خاص طور پر ذکر، ان کی وفات پر دیئے جانے والے بیان میں ہندوستان کے ایک عظیم مفکر نے کیا ہے)

آخر میں مرحوم کا وہ آخری مطبوعہ خط پیش کیا جارہا ہے، جس کے حرف حرف سے سوزِ دروں دارالعلوم اور اس کے مسلک و جماعت کی حفاظت کیلئے بے قراری اور اس کی زبوں حالی پر دل فگاری ٹپک رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط روشنائی

سے نہیں خونِ جگر سے لکھا گیا ہے۔

ان باتوں کے ساتھ خط سے مرحوم پر لگائے جانے والے الزامات ضعفِ دماغی سے لے کر قوت فیصلہ سے محرومی اور دوسروں کے زیر اثر ہونے تک کی حقیقت بھی اہل نظر پر آشکارا ہوجاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس مکتوب کا شائع ہوجانا ہی موصوف کی کرامت اور ان کی اخلاص کی روشن دلیل ہے۔ لیجئے تاریخی خط کے اہم حصے آخر میں ملاحظہ کرکے آج پھر اس پیکر اخلاص و مجسمۂ اخلاق کی یاد تازہ کرلیجئے۔

"دارالعلوم دیوبند صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ اللہ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبہ میں امت کی راہنمائی اور عوام امت کی خدمت اس کا نصب العین رہا ہے، آج اس کا کیا حال ہے؟ اور ہم اللہ کے سامنے مسئول ہیں۔ یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے...... نہ اپنی ذات کا غم ہے، نہ اپنے عزیزوں کا بلکہ غم دارالعلوم کا ہے، جماعت جو ایک سوسولہ برس تک اوروں کے لئے ہدایت، تقویٰ، اور توحید کی علامت تھی، بکھر کر رہ گئی ہے۔ یہی میری بیماری ہے...... اس عالم بے چارگی اور بیماری میں آپ کا مکتوب گرامی ملا (واضح رہے کہ اس خط کے مخاطب ایک ایسے بزرگ ہیں جن کے اختلافات موصوف سے اس وقت آخری نقطہ تک پہنچ کر اذیت ناک بن گئے تھے) جسے میں اپنے لئے اور دارالعلوم کے لئے روحانی صحتمندی کی علامت سمجھتا ہوں...... معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں...... بلکہ ہمارے اسلاف کی یادگار دارالعلوم کا ہے...... ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو

دعا مانگیں ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جوابدہی سے نجات ملے...... زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہو جائے''

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اللّٰهم اغفر له و ارحمه و اکرم نزله و سبتع علیه مشابیة رحمتک و ادخله جنة الفردوس۔

(ماخوذ از ''تذکرۂ طیب'' مرتبہ: مولانا ابوبکر غازی پوریؒ)

حضرت حکیم الاسلام
اور
وقف دارالعلوم دیوبند کی ابتدا

آج سے ۲۸ سال قبل ۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء کو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ومتولّی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا انتقال ہوا، اس عرصہ میں حضرتؒ کی شخصیت اوران کی دینی، دعوتی، انتظامی، تصنیفی اورتبلیغی خدمات پر جو کچھ بھی لکھا گیاہے،اس کا حاصل یہی ہے کہ دارالعلوم کوایشیا کی عظیم اسلامی یونیورسٹی بنانے میں مرکزی کردار حضرت کا ہی رہاہے،اس کے علاوہ انھوں نے دین وملت کے لئے جومخلصانہ خدمات انجام دیں ، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا زریں باب ہے، بعدازمرگ کارناموں کا اعتراف اورخراج عقیدت ایک عام سی روایت ہے، کسی شخصیت کی زندگی میں اس کی خدمات اوران کی حیثیت پر زیادہ نہیں لکھا جاتا،مگر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی میں ہی ان کی خدمات کو برملاتسلیم کرکے خراج عقیدت پیش کیا گیاہےاوراجتماعی طور پر ان کےخلوص وجدوجہد،حسن انتظام وجذبۂ دعوت وتبلیغ کوسراہا گیا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی ابتداء ہے، جب مسلمانوں کا اقتدارختم ہوا، ان کی تہذیب ختم ہونے لگی اور باضابطہ اسلامی عقائد

وشعائر کو مٹانے کی اعلانیہ سازش رچائی گئی، علماء کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جانے لگا، یا ملک بدر کئے جانے کا حکم صادر ہوا، اس وقت دینی تعلیمات کے تحفظ اور مسلمانوں کے ایمان وعقائد کی بقاء کے لئے چند بزرگوں نے دیو بند میں ایک اسلامی عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی جو روایتی تعلیم گاہوں سے جداگانہ روش اور اصولوں کا حامل تھا، جو کسی حکومت یا شخصیت کی مالی سرپرستی سے آزاد اور صرف مسلمانوں کے تعاون پر منحصر رہا، بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسی لئے اصول ہشتگانہ مقرّر فرمائے، وہی اصول اس ادارے کی بنیاد ہیں، عوامی تعاون سے قائم ہونے والا یہ پہلا دینی ادارہ تھا، جو وقف علی اللہ اور کسی بھی حکومتی یا شخصی تسلط سے آزاد تھا۔

پھر جہاں ایک طرف اس مدرسہ کے ذمہ داروں کے لئے تعلیمی و تربیتی نظم جاری رکھتے ہوئے عام مسلمانوں سے تعاون حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کرنی تھی، وہیں استعماری حکومت کے دست برد سے اس ادارے کو محفوظ رکھنے کی اہم ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی، اور دوسری طرف برصغیر کے مسلمانوں کی توجہ بھی دارالعلوم کو حاصل رہی۔ حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ سے لے کر حضرت حکیم الاسلام کے اہتمام وانتظام کے زمانے تک دارالعلوم طبعی رفتار سے ترقی کرتا رہا، لیکن پچاس سال گذرنے تک اس ادارہ کی وہ حیثیت نمایاں نہ ہوسکی، جو اس کے بانیان نے متعین کی تھی، یہ صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک مکتب فکر، تحریک اور اسلامی قلعہ تھا، جو طلبہ کی تعلیم وتربیت سے سوا خدمات کا متقاضی تھا۔

اکابر دیو بند کے اخلاص وعمل، خلوص نیت اور مسلسل جدو جہد کو خداوند قدوس نے شرف قبولیت سے نوازا اور اس ادارے کو عالمی حیثیت عطا کرنے کے لئے اپنے مخلص ترین برگزیدہ بندے حضرت حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب

صاحبؒ کو مہتمم کی صورت میں ایک عبقری شخصیت میں اجاگر کیا۔

اور پھر قادر مطلق نے دنیا کو باور کرادیا کہ کسی کے خلوص، محنت، جدوجہد، ایثار اور ایمان ویقین کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہی عربی مدرسہ دینی تعلیم گاہوں میں مرکزی حیثیت کا حامل ہو گیا، اور اسلامی قلعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ بے شک خدا کی قدرت اور اس کی رحمت کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا کہ حضرت حکیم الاسلام کے ذریعہ غیر اسلامی ملک میں یہ عظیم تر اسلامی ادارہ دینی تعلیمات کے ذریعہ دنیا کو منور کرنے لگا۔

اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے اخلاص عمل، مخلصانہ جدوجہد اور دارالعلوم کے لئے فنائیت کے جذبہ کا ثمرہ تھا، جنھوں نے اپنی زندگی اس ادارہ کے لئے وقف کردی، شہروں اور گاؤں کا سفر کرتے رہے، ملکوں ملکوں گھومتے رہے، تبلیغ دین کا اہم فریضہ بھی انجام دیتے رہے اور دارالعلوم کے لئے لوگوں کی توجہات حاصل کرتے رہے، اس ادارہ کا تعارف بھی کرایا اور اسلامی تنظیموں، دینی اداروں سے رابطے بھی قائم کئے، حضرت مہتمم صاحبؒ کو خدا نے علمی بصیرت سے بھی نوازا تھا اور افہام وتفہیم کا امتیازی مادّہ وملکہ عطا فرمایا تھا، اپنے مواعظ وخطبات سے مسلمانوں کو قرآن وحدیث کے علوم ومعارف سے آگاہ کرتے اور مجالس میں دارالعلوم اور اس کے اکابرین کا خصوصی تذکرہ فرماتے، اس طرح ملک وبیرون ملک ہر گوشے اور ہر خطہ میں پہنچ کر دین اور دارالعلوم کے مقاصد کی تبلیغ وترویج کرتے۔

دارالعلوم دیوبند کے ذمہ دار کارکنان میں آپ کی پہلی شخصیت ہے، جنھوں نے بیرونی ممالک کے سفر کئے ۔ برصغیر ہندوپاک، بنگلہ دیش کے علاوہ ایشیا کے دیگر ممالک اور امریکہ وافریقہ اور یورپ کے مختلف مقامات کے سفر کئے اور دارالعلوم کی ترقی وبہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان بہم پہنچایا، چنانچہ ان

کے زمانہ میں دارالعلوم نے جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں، تعلیمی، تعمیری اور دیگر شعبہ جات میں اضافے ہوتے گئے اور اس اسلامی ادارہ کو عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی گئی، وہ دارالعلوم کو ایسی حیثیت میں لے آئے کہ اب زیادہ محنت کی ضرورت تھی اور نہ لوگوں کو متوجہ کرنے کی، مسلمانان عالم ازخود اس کے تعاون کے لئے کوشاں رہنے لگے، حضرت حکیم الاسلامؒ کی دارالعلوم کے لئے ان خدمات کا اجتماعی اعتراف ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوئے اجلاس صدسالہ میں کیا گیا، جب مشاہیر علماء عالم اور رہنمایان ملک نے دارالعلوم کو خراج تحسین پیش کیا اور حضرتؒ کے کارناموں کا اعتراف کیا، اجلاس صدسالہ کے دوران ہی کچھ سیاسی اور اقتدار پسند عناصر نے دارالعلوم کو ہتھیانے کے منصوبے بنائے اور اپنے ہتھکنڈوں سے بہت سے سادہ لوح بزرگوں اور متعدد شخصیتوں کو مغالطہ دے کر حضرت حکیم الاسلامؒ کی ذات کو مجروح کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

وہ اپنے اس مذموم مقصد میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ دارالعلوم کی عمارتوں پر غاصبانہ قبضہ کرلیا، اس فتنے کے دوران کچھ ناعاقبت اندیش اور ایمانی بصیرت سے خالی افراد نے حضرتؒ کو بدنام کرنے کی سازش بھی کی، مگر اس مرد مجاہد اور خداترس بزرگ نے اف تک نہ کی، چنانچہ انکی رحلت کے بعد دنیا بھر میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے کارناموں کو سراہا گیا اور ان کے اخلاص و عمل کو عدیم المثال کارنامہ قرار دیا، حضرت نے دارالعلوم دیوبند پر غاصبانہ قبضے کے بعد بھی اس ادارہ کے بالمقابل کسی اور دارالعلوم کے قیام کو مناسب نہ سمجھا جب تک کہ دارالعلوم کی بنیادی روایات کو پامال نہ کردیا گیا۔

اور جب اس کے اصول و روایات اور وقف ہونے سے مخالفین نے عدالت میں انکار کردیا تب حضرتؒ نے روایات اکابر دارالعلوم اور اصول کی بقاء کے لئے

وقف دارالعلوم دیوبند کا آغاز فرمایا اور آپ نے خود اس کے لئے مسلمانوں سے اپیل کی، اب بحمد اللہ یہ ادارہ وقف دارالعلوم نیک نامی اور شہرت کی منزلیں طے کررہا ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے دو علمی جانشین چھوڑے، بڑے صاحبزادے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم وقف دارالعلوم دیوبند کے اہتمام وتولیت کی اہم ذمہ داری نبھانے کے ساتھ اپنے والد کی طرح ملک وبیرون ملک دینی اور تبلیغی دوروں پر تشریف لے جاتے ہیں اور مولانا محمد اسلم قاسمی وقف دارالعلوم میں تدریس کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں میں اپنی ایمانی تقریروں سے تبلیغ دین کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو حضرت حکیم الاسلام کا امتیازی وصف رہا ہے۔

حکیم الاسلامؒ
اور
مسلم پرسنل لا بورڈ

برطانوی استعمار اور مسلمانان ہند

ہندوستان میں مغلیہ عہد حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی ہندوستان آمد اور مغربی تہذیب وعلوم کی اشاعت شروع ہوئی اور سقوط حکومت ۱۸۵۷ء کے بعد تو ملک میں مکمل طور پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا، اور استعماری قوت نے خاص طور پر مسلم معاشرہ اور اسلامی تہذیب وقوانین کو اپنے جور و استبداد کا نشانہ بنایا، علماء دین اور دانشوران ملت پر ظلم وستم ڈھائے، کیونکہ یہی طبقہ انگریزی حکومت سے بغاوت کیلئے عوام کی رہنمائی اور سربراہی کرتا رہا، پھر مغربی علوم و ثقافت کو تمام باشندگان ملک پر مسلط کرنیکی پالیسی جاری ہوئی، اسلامی علوم وتہذیب کی بقاء وتحفظ کیلئے ملک کے گوشے گوشے میں علماء ومفکرین نے مسلمانوں کیلئے تعلیمی اداروں کی بنیادیں ڈال دیں، اس وقت تک ملک میں مسلم حکمرانوں کے ذریعہ جاری کردہ ملکی وعائلی قوانین ہی کا نفاذ ہوتا رہا، مسلم امت کے عائلی اور معاشرتی قوانین کی تنسیخ کی کوششیں نہیں ہوئیں، نہ ان میں تبدیلی کی پالیسی حکومت کے زیر غور رہی، یہ بھی حکومت وقت کی ہندوستان میں بغاوت اور افراتفری یا بدنظمی سے بچے رہنے کی

ایک مصلحت اور ملکی نظم کی ضرورت تھی، البتہ انگریزوں نے اسلامی قانون کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کی ابتدا کردی تھی، سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں حکومت برطانیہ نے فوجداری قانون کو ختم کیا، پھر قانون شہادت اور قانونِ معاہدات منسوخ کئے اور بالآخر مسلمانوں کے ''معاشرتی قوانین'' میں تبدیلی کی راہیں ہموار کی جانے لگیں اور اس کیلئے حکومت نے ''رائل کمیشن'' مقرر کیا، اس کمیشن نے قوانین اور صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو واضح کردیا کہ ان قوانین کا تعلق مذہب سے بہت گہرا ہے، اس لئے ان میں تبدیلی کا مطلب براہ راست مذہبی امور میں مداخلت اور مذہبی آزادی کو مجروح کرنا ہوگا، چنانچہ حکومت نے اقتدار کے تحفظ کیلئے مذہبی معاملات میں مداخلت کا ارادہ ترک کردیا اور کسی طرح کی تبدیلی کی بجائے مسلمانوں کیلئے ''قانون شریعت'' اور ہندوؤں کیلئے ''دھرم شاستر'' پرعمل آوری کو جاری کردیا۔ اسی دوران ۱۹۳۶ء میں ایک عدالت نے ہندو رواج کے مطابق وراثت میں بہن کو حصہ دینے سے انکار کردیا، ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ اسلامی قانون کے خلاف تھا، اس لئے اس وقت کے علماء کرام نے تحفظ شریعت کے عنوان سے اس فیصلے کے خلاف آواز بلند کی اور زبردست جدوجہد کی، ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۹۳۷ء میں ''شریعت اپلی کیشن ایکٹ'' بنا جس کے مطابق مسلمانوں کیلئے اس کی گنجائش ہوئی کہ وہ اپنے عائلی قوانین (نکاح، طلاق، خلع، ظہار، فسخ نکاح، حق حضانت، ولایت، میراث، وصیت، ہبہ اور شفعہ) میں شریعت اسلامیہ کے پابند رہیں، عدالت کو پابند کیا گیا تھا کہ فریقین مسلمان ہوں تو شریعت اسلامی کے مطابق فیصلہ ہوگا، خواہ ان کا عرف و رواج کچھ بھی ہو، بہرصورت قانونِ شریعت کو اس پر بالادستی حاصل ہوگی۔

آزادی کے بعد

۱۹۴۷ء میں ملک برطانوی غلبے سے آزاد ہوا تو ملک دو حصوں میں منقسم

ہوگیا، ہندوستان کا مغربی اور مشرقی حصہ الگ ہوکر ایک نئی مملکت بنا، ہندوستان میں رہنے والوں میں ہر مذہب کے ماننے والے موجود تھے، ہندوؤں کی بڑی اکثریت تھی اور دوسری بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی ان کے علاوہ عیسائی، سکھ، بودھ، جین اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی بڑی تعداد رہی، اب نہ مسلمانوں کی حکومت باقی رہی، نہ برطانوی استعمار، ملک کو منظم اور متحد رکھنے اور تمام فرقوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں ان بنیادوں پر حکومت کی تشکیل ہوئی، نئے ملک کیلئے دستور سازی کا مرحلہ پیش آیا، تو اسکو ایک جمہوری اور عوامی ملک قرار دیا گیا، جسکی تشکیل برطانوی طرز حکومت پر ہوئی۔ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ایوان قانون ساز ادارہ قرار پایا، آئین اور دستور بنائے گئے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سربراہی میں بنیادی اور رہنما اصولوں پر مشتمل دستور بنا، جس میں دفعات کے تحت حقوق، عدل و انصاف اور ملک کیلئے قوانین کی تصریحات موجود ہیں، ان میں سیکولرزم کو بنیادی حیثیت دی گئی، یعنی غیر مذہبی حکومت، دستور ساز کمیٹی نے بنیادی اصولوں میں ملک کے تمام شہریوں کو اپنے مذہب، تہذیب اور عائلی قوانین پر عمل کی آزادی رکھی، چنانچہ دفعہ ۲۹ میں وضاحت ہے کہ تمام شہریوں کو اپنے رسم و رواج اور شریعت کے مطابق عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ اسی کے ساتھ دستور میں کچھ رہنما اصول بھی طے کئے گئے تھے جن میں ایک دفعہ (۴۴) تھی جس کے مطابق حکومت کو ہدایت یا اجازت دی گئی کہ وہ پورے ملک میں ''یکساں سول کوڈ'' کے نفاذ کی کوشش کرے، اس رہنما اصول میں مسلمانوں کے عائلی قوانین (مسلم پرسنل لاء) میں مداخلت کی گنجائش موجود تھی، اسلئے مسلم ممبران اور قائدین نے اس پر سخت اعتراضات کئے اور اس میں ترمیمات پیش کیں، مگر ڈاکٹر امبیڈکر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کیا کوئی حکومت یہ پسند کرے گی کہ ملک کی ایک

بڑی آبادی مسلمان اسکے خلاف ہوجائے، اور کوئی پاگل حکومت ہوگی جو ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوششیں کریگی۔

اس رہنما اصول کے علاوہ بھی کچھ رہنما اصول شاملِ دستور کئے گئے جو ملکی مفادات میں تھے، مگر ان اصولوں پر توجہ دینے کی حکومت کی جانب سے کوئی کوشش ہی نہیں ہوئی، البتہ چندسال گذرنے کے بعد ہی حکومت کی بعض ایجنسیوں کی جانب سے یکساں سول کوڈ لاگو کئے جانے کی آوازیں اٹھنے لگیں۔ ۱۹۵۶ء میں جب ہندو پرسنل لاء میں تبدیلی کی گئی تو اس وقت کے وزیر قانون مسٹر پاٹیکر نے اس بات کا اشارہ دیا کہ یہ ترمیم یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی پہلی کڑی ہے، بتدریج اسکو پورے ملک میں نافذ کیا جائے گا۔ اس سے علماء دین و دانشوران ملت چونک اٹھے، پھر جب حکومت کو محسوس ہوا کہ مسلمانان ہند قانون شریعت میں کسی بھی تبدیلی کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو حکمت عملی بدل دی گئی، اوراعلان کردیا گیا کہ جب تک مسلمان خود مطالبہ نہ کریں ان کے پرسنل لا (عائلی شرعی قوانین) میں تبدیلی نہیں کی جائے گی، مگر کچھ فرقہ پرست جماعتوں اور حکومت میں شامل عناصر کی جانب سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی آوازیں گاہے بگاہے سنائی دیتی رہیں، پھر درپردہ کچھ ایسے افراد کے ذریعہ سے اس طرح کی باتیں کہی جانے لگیں، یا کہلائی جانے لگیں جو نام کے مسلمان تو تھے مگر ایمان وعمل اور شریعت کی ضرورت واہمیت سے بے گانے تھے، گویا حکومت کیلئے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے راستے ہموار کئے جانے لگے، اس کا اظہار ۱۹۷۲ء میں ''متبنّٰی بل'' کی صورت میں ہوا، جو تمام شہریوں (بشمول مسلمان) کیلئے قابل نفاذ ہوتا، اس وقت کے وزیر قانون نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ مسودہ قانون یکساں سول کوڈ کی طرف پہلا مضبوط قدم ہے۔ اس بل کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے متوقع درپیش خطرات

کے بادل منڈلانے لگے، علماء دین، قائدین اور دانشوران قوم کے سامنے تحفظ شریعت کے حوالے سے سوالیہ نشانوں کی ایک لمبی لائن کھڑی ہوگئی۔

دارالعلوم دیوبند کا کردار

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں، بلکہ ایک علمی اور دینی تحریک کا عنوان ہے، ۱۸۶۶ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء علماء دین کے ذریعہ بغاوت ۱۸۵۷ء کے بعد کے پرآشوب دور میں ایک علمی اور دینی تحریک کا آغاز ہوا، جسکے مقاصد میں جہاں دینی علوم کی حفاظت واشاعت تھی ، وہیں تحفظ شریعت اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بقاء کیلئے جدوجہد کرنا بھی تھا، ہندوستان کی آزادی کے وقت برصغیر ہند کے علاوہ بیرونی دیار میں بھی ایک دینی واسلامی مرکز کی حیثیت سے معروف ومستند بن چکا تھا، ملک کی آزادی کے بعد مسلمانوں کی پسماندگی، مایوسی اور پریشانی کے حالات میں دین وشریعت کیلئے ایک منارۂ نور تھا، جہاں اس ادارے نے قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تدریس واشاعت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں وہیں مسلمانوں کے دین وشریعت اور عائلی قوانین میں ان کی رہنمائی کا فریضہ بھی ادا کیا۔ دین، اسلامی احکام اور شریعت کے دفاع میں بھی دارالعلوم اور اس کے فرزندوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیئے، اس حوالے سے ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں بھی دارالعلوم دیوبند کی جانب اٹھتی رہی ہیں۔

جب یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور اس کی ابتدا ''متبنّٰی بل'' کی شکل میں نمودار ہوئی، تو اسکے مہتمم اور جانشینِ تحریک قاسمی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ کو بیحد تشویش ہوئی، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے بھی حضرت حکیم الاسلام کو اس اہم مسئلے کی جانب متوجہ کیا جسکا تعلق تحفظ شریعت سے تھا، ان حضرات کی تحریک سے اکابر

دیوبند اور مجلس شوریٰ کی ایک خصوصی نشست کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں منعقد گئی، جس میں اراکین شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ ملک کے بعض دانشوروں و قانون دانوں کو مدعو کیا گیا، قابل ذکر شخصیات میں حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ، عالیجناب مولوی محمد یونس سلیم صاحب مرکزی وزیر و سابق گورنر بہار اور معروف قانون داں پروفیسر طاہر محمود صاحب جیسے افراد شریک ہوئے، حالات کا جائزہ لینے کے بعد حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے فوری طور پر ایک کنونشن منعقد کرنے کی تجویز فرمائی، حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت پر دیوبند سے ایک وفد بمبئی گیا، تاکہ وہاں کے علماء اور دیندار مسلمانوں کو کنونشن منعقد کرنے کیلئے آمادہ کریں اور اسکا طریقہ کار متعین کریں، ملک بھر کے مشائخ عظام، علماء کرام، ماہر قانون داں مسلم افراد اور قائدین ملت سے رابطے کئے گئے، اور طے پایا کہ ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں ایک تاریخ ساز اجلاس منعقد ہو جو تحفظ شریعت کے عنوان سے ہو، اس طرح ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' کا انعقاد ہوا جو ہندوستان کی تاریخ میں مختلف حیثیتوں سے پہلا تاریخی اور عظیم الشان اجلاس تھا، جو ملک کے تمام مسلمانوں کی اتحاد و جمعیت کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا، جسکی قیادت حکیم الاسلام اور حضرت امیر شریعت رحمہا اللہ فرما رہے تھے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام

دارالعلوم دیوبند میں اکابر امت کی نشست کے بعد حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مؤرخہ ۲۷/۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئی میں وہ عظیم الشان تاریخ ساز ''مسلم پرسنل لا کنونشن'' منعقد ہوا، جہاں مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی داغ بیل پڑی، یہ اجلاس ہندوستان کی تاریخ میں لاثانی اور بے مثال تھا، اسمیں شرکت کرنیوالوں کی تعداد کے لحاظ سے بھی، اور

اسمیں جلوہ افروز ہونے والی مسلم تنظیموں، فرقوں، مختلف مسالک کے اعلیٰ ترین علماء ومشائخ، مسلم قائدین، سیاسی مسلم رہنماؤں اور اہل علم، دانشوروں کی شخصیتوں کے اجتماع کے لحاظ سے بھی، جس میں پہلی بار مسلمانوں کے تمام مسالک اور تنظیموں کے جلیل القدر رہنما موجود تھے، اتحاد امت کا ایسا نظارہ برصغیر ہند نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، مسلمانوں کے اتحاد کا ایسا انوکھا اور نمائندہ اجتماع کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ آج ہندوستان کے کسی گوشے میں جا کر دریافت کرو کہ مسلمانوں کے فلاں رہنما، قائدین اور علماء کہاں ہیں تو ایک ہی جواب ملے گا کہ وہ سب آل انڈیا مسلم پرسنل لاکنونشن میں ہیں، بمبئی کے نامور افراد نے شرعی قوانین کے عنوان پر اس عظیم کنونشن کیلئے انتھک جدو جہد کی، علماء، دانشوران اور دیندار مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کی کامیابی کیلئے سرگرم رہا، خاص طور پر جناب یوسف پٹیل صاحب جو بعد میں بورڈ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

تحفظ شریعت اور مسلمانوں کے ملّی تشخص کی بقاء کا عنوان تھا اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کی دعوت تھی، بلاتفریق مسلک ومشرب سب ہی جمع ہوئے، حنفی، شافعی بھی تھے، اور اہل حدیث بھی، سنی بھی اور شیعہ بھی، دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی، داؤدی بوہرہ بھی اور سلمانی بوہرہ بھی تھے، اور سبھوں کی ایک ہی آواز تھی، ہم شرعی قوانین پر عمل پیرا رہیں گے، اور اس میں کسی طرح کی کوئی ترمیم اور مداخلت قبول نہیں ہوگی۔ یہ خالق کائنات کے بنائے قوانین ہیں اس میں ترمیم وتبدیلی کی گنجائش نہیں، پورے اجلاس کا ایک ہی عنوان تھا "لاتبدیل لکلمات اللہ" (اللہ کے فرمان میں کوئی تبدیلی نہیں)

اس اجلاس کے صدر حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں سب سے پہلے حاضرین اور منتظمین کا شکریہ ادا کیا تھا، پھر بڑی

تفصیل کے ساتھ واضح فرمایا کہ اسلامی شریعت کوئی انسان کا وضع کردہ نظام نہیں ہے، جس میں تبدیلی کی گنجائش ہو، یہ خدا کا قانون ہے، قانون فطرت ہے اور فطرت تبدیل نہیں ہوسکتی، اگر کوئی زمین، آسمان، چاند، سورج اور کواکب و نجوم کو نہیں بدل سکتا، صرف اس سے فائدہ ہی اٹھا سکتا ہے تو دین کے کلیات و جزئیات، احکام وآداب، اخلاق وعقائد، معاملات ومعاشرت اور اجتماعی قوانین سے لے کر عائلی قوانین تک کی فطری حدود کو بھی نہیں بدل سکتا۔

پھر مختصر طور پر عائلی قوانین اور مسلم پرسنل لا کی تبدیلیوں اور امت کے علماء ربانی و مشائخ حقانی کے دفاع کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت سرکاری کارروائیوں اور اعلانات کا ذکر کیا اور مسلمانوں کی آواز کے بارے میں فرمایا تھا:

''پرسنل لا کے بارے میں سرکاری طور پر گویہ بھی اعلان ہے کہ اسمیں مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی بھی ترمیم وتبدیلی نہیں ہوگی، لیکن ساتھ ہی بالواسطہ قانون سازی کے ذریعہ تبنیت اور سرکاری ملازمین کے لیے نکاح ثانی کے حق پر پابندی نے جو پرسنل لا میں عمل ترمیم کا آغاز ہے پرسنل لا کے بارے میں مسلمانوں کی تشویش کو حق بجانب بنادیا ہے۔ اس لئے وہ متفقہ آواز اٹھانے پر مجبور ہوئے اور جس کی گونج ان شاءاللہ رائیگاں نہیں جائے گی۔''

اسی کنونشن میں ایک متحدہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تمام افراد متفق ہوئے اور طے پایا کہ اگلے ہی سال حیدرآباد میں ایک اجلاس عام منعقد کرکے ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کا آغاز ہوجائے، چنانچہ ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد میں اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اجلاس منعقد ہوا اور باتفاق آراء حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری

محمد طیب رحمۃ اللہ کو بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو جنرل سکریٹری، درحقیقت یہی دونوں حضرات اس کے محرّک اوّل تھے، اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی اور ایک عدیم النظیر اجتماعی تنظیم وجود میں آئی۔

خاندان نانوتویؒ کے روشن چراغ اور اکابر دیوبند کے علمی جانشین حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے اندر مسلمانوں کے مختلف طبقوں، مکاتب فکر اور مسلک ومشرب کے لوگوں کو ساتھ لیکر چلنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور عالمی دینی تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے انتظام وانصرام کا پچاس سالہ تجربہ تھا، دارالعلوم دیوبند کے تعارف اور دعوت کے مقصد سے دنیا کے تمام براعظموں کا سفر ہو چکا تھا، پوری دنیا میں ان کے مواعظ وخطبات کا شہرہ تھا، اور ہندوستان کے تمام علاقوں میں اور ہر مسلک وفرقے میں انھیں مقبولیت حاصل تھی، اس وقت ان جیسی جامع العلوم، حامل اخلاق فاضلہ اور معروف ومقبول شخصیت انھیں کی تھی اور متحدہ طور پر سب ہی کو اُن پر اعتماد تھا۔

قافلہ رواں دواں

''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کی باضابطہ تشکیل اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے اجتماع عظیم کی ساری کارروائی حکومت ہند تک بھی پہنچی، چنانچہ حکومت نے اس ''متبنّٰی بل'' کو سرد خانے میں ڈالدیا اور بالآخر ۱۹۷۸ء میں جنتا حکومت نے اسے واپس لے لیا تھا۔

ابھی اس تنظیم کے تعارف اور اسکے اغراض ومقاصد کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کا عمل جاری تھا کہ ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی اور تمام بڑے سیاسی وسماجی رہنماؤں کو جیل میں ڈال دیا گیا، جمہوری نظام معطل ہوگیا اور ہر فیصلہ بزور قوت نافذ کیا جانے لگا، خاص طور پر

''تحدید نسل'' کیلئے جبری نس بندی کا عمل شروع ہو گیا، عمل تولید کے فطری قانون پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں، اور حکومت کے فیصلوں پر احتجاج کی ساری راہیں جبراً مسدود کر دی گئیں، یہ قانون بھی شریعت اسلامیہ کے خلاف تھا، مسلمانوں کے عائلی قوانین پر تنسیخ کا عمل تھا۔

اسلئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی قیادت اور حضرت امیر شریعت کے جرأتمندانہ اقدام کے تحت اس پر آشوب اور سخت کٹھن مرحلے میں دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا اور تمام متوقع خطرات اور قید و بند کی صعوبتوں کے علی الرغم بورڈ نے حکومت کے اس فیصلے کی سخت مخالفت کی اور واضح کیا کہ مسلمانوں کیلئے قانون ضبط ولادت کیلئے جبری نسبندی قطعی قبول نہیں ہے، یہ ایک تاریخ نشست تھی اور تاریخ ساز فیصلہ جسے آج بھی تاریخ، مسلم پرسنل لا بورڈ کے نمایاں ترین خدمات اور کارنامے کے بطور محفوظ کئے ہوئے ہے۔

پھر ۱۹۷۸ء میں الٰہ آباد ہائی کورٹ کے لکھنؤ بنچ نے مساجد و مقابر کو ایکوائر کرنے کے سلسلے میں ایک ایسا فیصلہ صادر کر دیا جو نہایت سنگین نتائج کا حامل تھا، جس کے مطابق حکومت مساجد و مقابر کی ملکیت کبھی بھی سلب کر سکتی تھی، بورڈ نے اسکے خلاف پورے ملک میں تحریک چلائی، اس جدوجہد کے نتیجے میں یوپی اور راجستھان نے ایکوائر کے احکام واپس لے لئے۔

پھر ۱۹۸۰ء کو اوقاف کی جائیدادوں پر حکومت کی جانب سے ٹیکس عائد کرنے کے احکامات جاری ہوئے، مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور اوقاف کی جائدادوں کو ٹیکس سے مستثنٰی کروانے میں بورڈ کامیاب رہا۔

۱۷؍جولائی ۱۹۸۳ء کو بورڈ کے بانی و محرک و قائد اوّل حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا انتقال ہوا۔ اگست ۸۳ء میں مدراس کے اجلاس

عام میں نئے صدر کے بطور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ منتخب ہوئے، ۲۰۰۰ء میں ان کی وفات کے بعد فقیہ وقت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صدر بنے، انکی مدت صدارت مختصر رہی، دوسال کے بعد ہی حیدرآباد کے اجلاس عام میں موجودہ صدر حضرت مولانا محمد رابع ندوی زیدمجدہم کی سربراہی طے پائی جو اب تک جاری ہے۔

بطل جلیل، عالم ربانی حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی وفات ۱۹۹۱ء کے بعد حضرت مولانا سید نظام الدین (امیر شریعت بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) بحیثیت جنرل سکریٹری تاحیات اس متحدہ تنظیم کی قیادت کو اپنے تجربات، دوراندیشیوں اور دیگر عہدے دارانِ بورڈ کے مشوروں سے پوری ذمہ داری سے بخوبی انجام دیتے رہے۔

گذشتہ پچیس سالوں سے بورڈ زیادہ فعال، متحرک، اور مؤثر ادارے کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کی نمائندہ تنظیم بن کر ہندوستان کے افق پر اس طرح ابھرا ہے کہ ملک کے گوشے گوشے میں اسکا تعارف ہے، اور اسکی خدمات کا دائرہ اور میدان عمل وسیع ہوا ہے، شاہ بانو کیس، بابری مسجد کا انہدام اور مختلف عدالتوں کے مسلم پرسنل لاء مخالف فیصلوں کے دفاع کا معاملہ ہو یا مسلمانوں میں شرعی قوانین پر عمل کرنیکی ترغیب، دارالقضاء کا قیام اور تحریک اصلاح معاشرہ ہو ہر جہت میں بورڈ کی ہمہ گیر خدمات اور مسلسل جدوجہد، مسلمانان ہند کی تاریخ کا تابناک باب ہے۔

حضرت حکیم الاسلام
کا
ادبی ذوق اور شعروشاعری

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، ہندو بیرون ہندان کی شہرت مہتمم دارالعلوم دیوبند اور عظیم خطیب کی حیثیت سے زیادہ نہ تھی، ورنہ وہ بیک وقت عالم وفقیہ، شیخ طریقت، مربی ومرشد، منتظم ومہتمم اور خطیب وواعظ تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داریوں سے اس طرح سبکدوش ہوئے کہ ایک عربی مدرسہ کو دارالعلوم دیوبند پھر الجامعۃ الاسلامیہ دارالعلوم دیوبند اور ازہر الہند کا مقام عطا کردیا، اور پھر اس تحریک کے مسلک کو پوری دنیا میں متعارف کرا کر دارالعلوم کو مرکزیت اور مقبولیت کی سند دلادی، اسلامیان ہند کی تاریخ مرتب کرنے والوں کو ایک جلی عنوان فراہم کردیا۔

ایک عالم وفقیہ کی حیثیت سے انھوں نے جو مضامین یا کتابیں تحریر فرمائیں وہ تحقیق کا عمدہ نمونہ اور حکمت ریز نکتہ آفرینیوں کا مرقع ہیں، دینی مسائل اور قرآنی مضامین کو عصر حاضر کی تحقیقات اور سائنس کی روشنی میں اہل علم وجدید علوم کے ماہرین کے دل ودماغ میں مؤثر بنادیا، ان کی شائع شدہ کتابوں کی تعداد پچاس

سے متجاوز ہیں اور مضامین سیکڑوں ہیں، جو ہمیشہ کیلئے کتب خانوں میں علمی ورثے کے طور پر موجود ہیں۔

شیخ ومرشد کے منصب سے انھوں نے اپنی زندگی اوراخلاق وکردار کو متوسلین کے لئے نہ صرف نمونہ بنا کر پیش کیا بلکہ ان کی روحانی اصلاح اور رہنمائی بھی کی، حضرت کا مقام ارباب تصوف وطریقت میں بھی نمایاں اورممتاز ہے، انھوں نے حضرت تھانویؒ کے سلسلے کو رونق بخشی۔

اور بحیثیت خطیب و واعظ کے بلاشبہ ان کی کوئی نظیر بیسویں صدی میں نہیں ملتی، ان کا حسن بیان، علمی تعبیرات، سحر انگیز تکلم، خطاب میں نکتہ آفرینیاں، پرسکون دریا کی سی سلاست اور تین، چار گھنٹوں کا خطاب ہندو پاک اور یورپ وافریقہ تک ایک ایسا وصف ہے جو صرف ان کا ہی امتیاز اور شناخت ہے۔

یہ تمام اوصاف ان کی زندگی کے وہ روشن پہلو ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا اور تاریخ میں درج ہے، مگر ان سب مشاغل کے ساتھ ہی ادبی ذوق کے اجاگر ہونے کی فرصت ملنا، اس کا تصور بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت کو ابتدا ہی سے ادبی ذوق رہا اور وہ شعروشاعری بھی کرتے رہے۔ اور آپ کی شاعری صرف اردو زبان ہی تک محدود نہیں ہے، فارسی اور عربی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ آپ کے شعروشاعری کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے، جن میں ''عرفانِ عارف'' اور ''آنکھ کی کہانی'' زیادہ مشہور ہیں۔

دراصل حضرت حکیم الاسلام کی تعلیم وتربیت جس زمانے اور ماحول میں ہوئی تھی اس میں اردو، فارسی اور عربی اشعار کا چرچا بھی تھا، ان کا گھرانہ خالص علمی ودینی تھا، ادب سے بھی متعلق تھا اسلئے ان کی طبیعت میں علمی وادبی تاثر بھی لازمی تھا، چنانچہ انھوں نے بچپن ہی سے اچھے اشعار موزوں کرنے شروع کردیئے تھے

اور ابتدا میں اپنا تخلص بھی عارفؔ رکھا ہے، گرچہ بعد میں بغیر کسی تخلص کی قید کے اشعار کہے۔ فارسی اور عربی ان کی درسیات میں شامل تھی اور ان زبانوں پر انھیں کامل قدرت تھی اسلئے ان میں اشعار بھی عمدہ ترین کہے، مگر زیادہ تر اشعار اردو زبان ہی میں ہیں، اور عام طور پر صنف نظم میں زیادہ ہیں، وہ چونکہ روایتی شاعر نہیں تھے اور نہ اخبارات و رسائل کیلئے نظمیں لکھیں اسلئے ان کے ادبی مذاق اور جوہر شعر وشاعری کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

اور جس طرح ان کی نثری تحریریں اور مضامین دینی، علمی اور واقعاتی نوعیت کی ہیں، اسی طرح ان کی شاعری واقعات وحادثات پر ذہنی تاثر، حقیقی جذبات اور تبادر ذہنی پر مبنی ہے، چنانچہ انکی نظموں میں جماعت دیوبند یا اہم واقعات وحادثات کے تذکرے ملتے ہیں، اسی لئے ان میں آورد نہیں بلکہ آمد ہے، تصنع نہیں سادگی ہے، سلاست وروانی ہے اور صنف غزل سے عدم دلچسپی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی تصانیف اور مضامین ہیں اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کسی لائبریری میں یا بہت پرسکون مسند پر بیٹھ کر تحریر فرمارہے ہوں، مگر یہ حلقۂ دیوبند اور ان سے قریب رہنے والے افراد خاص طور پر جانتے ہیں کہ جب موقع ملا، جہاں ملا لکھنے میں مشغول ہوگئے، حضر میں ہوں یا سفر میں، ٹرین میں ہوں یا جہاز میں، ان کے مضامین جاری رہتے، اسی طرح ان کی شاعری کو کسی تنہائی، یکسوئی یا خاص ماحول کی ضرورت نہیں ہوتی ہوگی، ان کا مجموعۂ کلام ''عرفان عارف'' شائع ہوا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت اس میں بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اور جب ۱۹۶۳ء میں علی گڑھ میں ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا تو اس واقعہ پر انھوں نے ایک طویل نظم تحریر فرمائی تھی ''آنکھ کی کہانی'' جس میں تقریباً ۱۶۷/اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس آپریشن کے دوران انھیں جو یکسوئی ملی

تو یہ طویل نظم سپرد قلم فرمادی جو نہایت معرکتہ الآراء نظم ہے جس میں آنکھ سے متعلق بہت سے فوائد، کیفیات اور حقائق بلیغ انداز میں بیان ہیں۔

جب ''آنکھ کی کہانی'' شائع ہوئی تو اہل علم وادب نے نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی بہت شہرت ہوئی، اور جب یہ نظم عالم جلیل اور اردو کے مایہ ناز انشا پرداز و ادیب حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے پڑھی تو اپنے تأثرات کا اظہار جن الفاظ میں کیا وہ بذات خود حضرت حکیم الاسلام کے اعلیٰ ادبی ذوق کیلئے ایک سند ہے۔ انھوں نے خط میں لکھا:

حضرت محترم السلام علیکم

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، مجھے علم نہ تھا کہ آپ کو شعر و ادب میں اس درجہ قدرت حاصل ہے۔ ذلک فضل اللہ

کیا کیا قافیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ور شاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں، نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد، خوش دماغ تو آپ بحیثیت ایک سچے قاسم زادہ کے تھے ہی اب معلوم ہوا کہ ماشاء اللہ خوش فکر بھی اسی درجہ میں ہیں۔ ماشاء اللہ

دعا گو و دعا جو

عبدالماجد دریابادی

۱۵ر دسمبر ۱۹۶۴ء

''آنکھ کی کہانی'' دو حصوں پر مشتمل اردو کی رزمیہ شاعری میں ممتاز مقام کی حامل ہے، جن میں مختلف موضوعات کو نظم کیا گیا ہے، حمد باری، نعت نبوی، آنکھ کی اہمیت و افادیت، آنکھ کے جامع مقامات، معالجے کا آغاز، معالجے کی کیفیت، تعمیر نو، انکشاف، عالم خواب، نتیجۂ علاج، پرہیز و احتیاط، معاونین کا تذکرہ، اظہار تشکر اور خاتمۂ کلام وغیرہ پہلے حصہ میں ہیں۔ دوسرے حصے میں حمد الٰہی، حقیقی ربوبیت کا

مقام، فقہاء کی نکتہ آفرینیاں ، دہریوں کے اعتراضات و اشکال، مشرکین اور مجوسیوں کے عقائد نیز ان کے مدلل جوابات، نعت نبوی، زمانۂ جاہلیت، جہالت کے اثرات، آفتاب نبوت کا طلوع، پروردگان نبوت کے اصطلاحی القاب، ختم نبوت کا ذکر اور شکوۂ چشم کا اثر، شکر و تشکر، علی گڑھ سے دیوبند واپسی کے تذکرے وغیرہ شامل ہیں۔

ان عنوانات و موضوعات کو یہاں ذکر کرنے کا حاصل یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت کی شاعری روایتی نہیں بلکہ خالص علمی اور دینی ہے جو ان عنوانات سے ہی ظاہر ہیں۔

اس نظم کو پڑھنے کے بعد جناب افضل اقبال صاحب نے جو اس زمانے میں ہندوستان میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے اپنے مکتوب میں اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

> ’’شعر کی سادگی، تخیل کی پرواز اور خلوص کی بہتات تمام ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی ذات سے نہایت آسانی سے منسوب ہوگئی ہیں، آپ کی روحانی عظمت کا تو کون قائل نہیں، یہ مثنوی آپ کے ملکۂ شاعری کا لوہا ہم جیسے کافروں سے بھی منواتی ہے۔ بہت ظلم ہوگا اگر آپ اپنے مشاغل میں صنف شعر کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔ اس ملک (ہندوستان) میں جہاں اسلام کو آپ کی ذات بابرکات سے تقویت پہونچتی ہے وہاں اردو بھی منت پذیر شانہ ہے۔‘‘

حضرت حکیم الاسلام کے ادبی ذوق اور ملکۂ شعر و شاعری کی پہچان کیلئے ان کے یہ دونوں مجموعے ’’عرفان عارف‘‘ اور ’’آنکھ کی کہانی‘‘ اہل علم و ادب کیلئے بہت ہیں، ہم یہاں ان کے بعض حمد، نعت اور نظموں کو بطور نمونہ درج کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

حمدالٰہی (بزبانِ اردو)

خدا کی ذات میں ہے ہر بڑائی　　پہنچی سکتی نہیں اس تک برائی
غنا ہے اس کی شانِ کبریائی　　نہیں محتاجگی کو واں رسائی
کمالات اس کے سب دریوزہ گر ہیں　　جمالات اس کے سب زیر اثر ہیں
وہی مبدا وجود اور جود کا ہے　　معاد آخر ہر اک بہبود کا ہے
بری ہر وہم و قیل و قال سے ہے　　بری ہر مثل و ہر تمثال سے ہے
جہانِ عرش و کرسی اور افلاک　　جہانِ غیب و شاہد اس کی املاک
عطا و جود کی ہے اس کی کیا بات　　ہے توحید و رسالت اس کی سوغات
عطیّہ رحمتِ مہداہ اس کا　　ہدیہّ علم و ادراکات اس کا
نبی ہوں یا ولی مجبور ہیں واں　　مہ و مہتاب سب مزدور ہیں واں
ہر اک ذرہ میں جلوہ اس کا پیدا　　ہر اک پیکر سے نور اس کا ہویدا

نعت رسالت پناہی

جہانِ ذکر اوصاف و کمالات　　فدائے ذکر والائے محمدؐ
بیاضِ روز و مہر و ماہ و انجم　　نثارِ زلفِ سودائے محمدؐ
ازل سے تا ابد ایام دنیا　　نثارِ لیل اسرائے محمدؐ
اگر ہے سرِّ حق دنیا میں ظاہر　　تو مظہر ذات والائے محمدؐ
اگر ہو علمِ ربّانی مصوّر　　تو ہو وہ نقشِ زیبائے محمدؐ
مجسم گر ہوں اخلاقِ الٰہی　　تو بن جائے سراپائے محمدؐ
کمالاتِ بشر ہیں ختم ان پر　　تو ہے پھر کون ہمتائے محمدؐ
ہے دنیائے دنی سورج سے روشن　　ضیاء مہر اسمائے محمدؐ
بلندی آسمانوں کی مسلّم　　تھے اسراء میں تہ پائے محمدؐ
طوافِ تن کو کعبہ بس ہے لیکن　　مطافِ روح ہے جائے محمدؐ
عروجِ قاسمیؔ کی انتہا ہے　　کہ ہے خاکِ کفِ پائے محمدؐ

انقلاباتِ دہر (بزبان فارسی)

ہماں گوہر کہ او بودہ جہاں تاب — جہاں از آبِ فیضش گشتہ بیتاب
بصد حیفم کہ نورِ مہر رخشاں — نہ ہر ذرّہ بود از مہر رخشاں
بافسوسم کہ ابرِ آبِ حیواں — نبارد از پئے اطفال بُستاں
بفریادم کہ فیضِ لا تناہی — گذارد تشنہ اندر آبِ ماہی
خدا را اے وفادارانِ دل ریش — بمن گوشے کہ می گویم غمِ خویش
چہ غم! افسانۂ صد درد و ماتم — بہ ہولِ روز رستاخیز ہمدم
چہ غم! جورِ فلک ہر صبح و ہر شام — چہ غم! تیر قضا بے وقت و ہنگام
چہ غم! من زندۂ و جانم تہِ خاک — چہ غم! تن سالم و درسینہ صد چاک
چہ غم! بے چادری و ابرِ باراں — چہ غم! بے مادری و شیرِ خواراں
چہ غم! بابے نوائی ساز کردن — چہ غم! فریاد بے آواز کردن
چہ غم! ماہی و ریگ گرم و گرما — چہ غم! مفلوج و آب سردو سرما
چہ غم! جامِ تہی ازبادۂ و خم — چہ غم! راہم دراز و زاد رہ کم
چہ غم! روپوشئ ایمان و جانم — چہ غم! بربادئ خان و مانم
چہ غم! بے تو جہاں پُر نالہ وشور — و چہ غم! بے تو ہزاراں زندہ درگور
تو اے مولائیم آخر کُجائی — زما رو پوش بے چون و چرائی

●

یہ کیسی دھوم ہے باغ جہاں میں آج اے ہمدم
گلوں سے بلبل نالاں گلے ملتی ہے کیوں پیہم
خوشی میں کیوں ترانے گارہی ہیں قمریاں باہم
برستا ہے یہاں پر ابر رحمت آج کیوں چھم چھم

ہوئے جاتے ہیں گل جامے سے باہر شادمانی سے
ہوئی جاتی ہے بلبل مست اپنی نغمہ خوانی سے
خرام ناز سے باد بہاری آج آتی ہے
بنا کر ہار پھولوں کا چمن میں ساتھ لاتی ہے
چمن میں ہر طرف سے یہ مبارک یاد آتی ہے
مبارک ہو بہار بے خزاں گلشن میں آتی ہے
پلا دے ایک ساغر ساقئ رنگیں بیاں مجھ کو
تری آنکھوں کے صدقے دے شراب ارغواں مجھ کو
بتا دے عالم اسرار کے راز نہاں مجھ کو
پلادے وہ مئے عرفاں کہ کردے بے نشاں مجھ کو
مضامیں کا چلا ہے دل سے اک قلزم رواں ہو کر
مرے عجز بیاں نے سر اٹھایا آسماں ہوکر
تخیل کے ہے سینے میں مضامیں کی فراوانی
تصور کے خزانے میں ہے تصدیق کی ارزانی
عرب کے وحشیوں کو وہ بتائی رہ تمدن کی
کہ یورپ کے مہذب خوشہ چینی کر گئے ان کی
وہ وحشی قوم جو کل تک کہ خود گمراہ پھرتی تھی
بنی ہے رہنما اللہ اکبر آج عالم کی
غرض اس قوم پر وہ وہ ہوئے الطافِ رحمانی
شتر بانی کہ بدلے میں ملی ان کو جہاں بانی
دل و جاں سے رہے جب تک کہ تم اسلام پر شیدا

سروں پر تھا تمھارے نیرِ اقبال کا سایا
مگر مذہب کی پابندی سے جوں ہی تم نے منھ موڑا
تو پھر اقبال نے بھی دوسری جانب کا رخ بدلا
نہ کی جب قدر اس کے نور کی کچھ اہل مشرق نے
طلوع آفتاب ہونے لگا آخر کو مغرب سے
عزیزو تم کہاں پھرتے ہو یوں حیران اور ششدر
ہے ٹھانی تم نے دل میں کیا بھروسہ ہے تمھیں کس پر
ترقی ڈھونڈتے پھرتے ہو کیوں غیروں کے برتے پر
نہ پہنچائے گا کیا اسلام معراجِ ترقی پر
تلاش آبِ حیواں میں کہاں جا کر بھٹکتے ہو
وہ ہے ریگِ رواں جس کو کہ تم پانی سمجھتے ہو
کمائی دولت دنیائے دوں بد خواہ دیں ہوکر
ڈسے گی یہ ترقی تم کو مارِ آستیں ہو کر
عبث تم چھوڑ کر اسلام کو پھرتے ہو یوں در در
اگر دنیا ہی ہاتھ آئی تو تف ہے اس ترقی پر
نہ لی تم نے صفت غیروں سے پابندئ مذہب کی
اسی کو چھوڑ بیٹھے بات تھی جو اصل مطلب کی
تمھارے دل کو بھائی ہے ادا غیروں کے مشرب کی
چھوا عقرب کو لیکن کی نہ پروا نیش عقرب کی
ستم ہے نور کو اندھیر ظلمت کی ضیاء سمجھے
پڑیں پتھر اس اوندھی عقل پر سمجھے تو کیا سمجھے

تمھاری عقل کا یہ پھیر ہے سوچو تو تم اتنا
زمانہ کب یہ کہتا ہے کہ مذہب چھوڑ دو اپنا
سلف نے وہ کئے تھے عزت و جاہ حشم پیدا
کہ یورپ خواب میں بھی اس ترقی کو نہ دیکھے گا
نئی تہذیب کی ان کو ذرا بو تک نہ پہنچی تھی
ذرا سوچو تو پھر کیسے ترقی ان کو حاصل تھی
اطاعت کیا نہ کرتے تھے سلاطین زماں ان کی
نہ تھی کیا کرسی اقبال رشک آسماں ان کی
ہمیشہ راہ پر رہتا تھا کیوں سارا جہاں ان کی
فرشتے چومتے تھے کیوں زمین آستاں ان کی
سبب یہ تھا کہ وہ اسلام کے، اسلام تھا ان کا
بجز مذہب کی خدمت کے نہ کوئی کام تھا ان کا

●

آنکھ قائم ہے تو ہے لذت رنگ و صورت
نہ رہے باقی تو موعود ہے جنت کا ثواب
ہو کھلی آنکھ تو اس سے ہے ظہور اعیاں
اور ہو بند تو ہے زیر نظر عالمِ خواب
آنکھ کھل جائے تو بھرپور ہے بجلی دل پر
نیم وا ہو تو بھری اس میں ہے مستی شراب
آنکھ نیچی ہو تو ہے نور حیا کا چشمہ
اور اٹھ جائے تو ہے نارِ فروزان عتاب
آنکھ پھر جائے تو ہے شعلۂ نفرت کی بھڑک
اور بھر آئے تو ہے بارش رحمت کا سحاب

آنکھ ترچھی ہو تو پھٹ جائے فضائے پیشیں
اور سیدھی ہو تو سیدھا ہے جہان اسباب
آنکھ گر امن پسند ہے تو ہے دل بھی آزاد
آنکھ لڑ جائے تو پھر دل ہے گرفتارِ عذاب
آگئی آنکھ تو کہتے ہیں کہ بیمار ہوئی
اور نہ آئی تو سمجھتے ہیں صحیح اور صواب
چشم حق بیں ہو تو ہے نافع دین و دنیا
چشم بدبیں ہو تو دارین کا خسران و عذاب
آنکھیں دو ہیں تو وہ ہیں کاشف الوان جہاں
چار ہوجائیں تو ہیں سر محبت کا نقاب
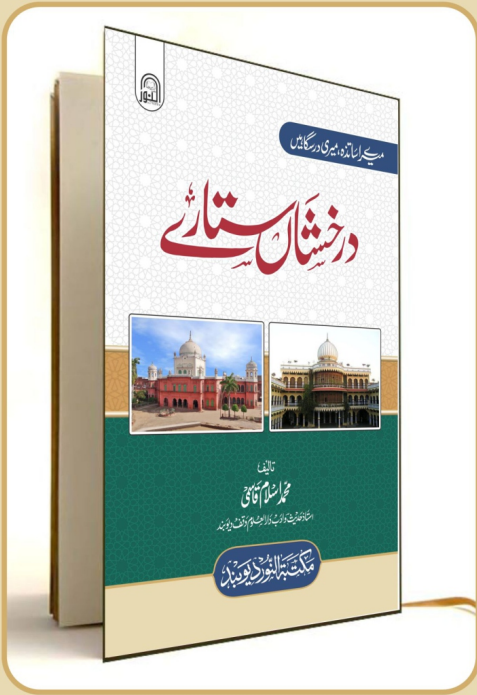
النور
MAKTABA
AL-NOOR

❖ دارالمؤلفین ٹیلگرام چینل ❖

دارالمؤلفین – اردو، فارسی، عربی اور انگریزی- کتب کا ایک بڑا اور نہایت کارآمد ٹیلیگرام چینل ہے۔ جس میں آپ کو سات ہزار سے زائد کتابوں کا عظیم ترین ذخیرہ، ہر موضوع پر الگ الگ فہرستیں، نیز مشہور مصنفین کی الگ الگ فہرستیں آپ کو ملیں گی۔ جیسے:

① عقائد و علم کلام	② تفسیر	③ علوم القرآن	④ احادیث
⑤ علوم الحدیث	⑥ شروحات حدیث	⑦ فقہ	⑧ اصول فقہ
⑨ احکام و مسائل	⑩ بلاغت	⑪ منطق و فلسفہ	⑫ نحو و صرف
⑬ ادب؛ عربی، فارسی، اردو	⑭ سیرت رسول اکرم ﷺ	⑮ سیرتِ صحابہ	⑯ سیرتِ اکابر
⑰ تازہ ترین رسائل و جرائد	⑱ درس نظامی (مکمل)	⑲ درود و دعائیں	⑳ رد فرق باطلہ

☆ Join & Share ☆

https://telegram.me/darulmuallifeen

❖ فہرست کتب ٹیلگرام چینل ❖

دار المؤلفین ٹیلگرام چینل میں اپلوڈ کی گئی؛ ایک سے زائد جلدوں والی کتب کی فہرست، مشہور شخصیات کی کتب کی فہرست اور درس نظامی کی (درجہ تا دورۂ حدیث و تکمیلات) کتب کی فہرست نیز فن اور موضوع کے اعتبار سے الگ الگ فہرست تیار کی گئی ہیں۔

☆ Join & Share ☆

http://telegram.me/darulmuallifeenfehrist

❖ رہنمائے خطباء ٹیلگرام چینل ❖

خطباءِ عظام کے لیے حالات حاضرہ کے مطابق خطبات و بیانات، مقالات مضامین اور ماہنامے سے مختلف عنوانات پر قیمتی مواد ڈاؤن لوڈ لنکس سمیت فہرست یا پی، ڈی، ایف کی شکل میں ارسال کی جاتی ہے۔

☆ Join & Share ☆

https://telegram.me/rahnuma_e_khutaba